بستی بستی صحرا صحرا

مصنف

حسن ساہو

بستی بستی صحرا صحرا

(افسانے)

مصنف

حسن ساہو

مرزا پبلیکیشنز حسن آباد، رعناواری۔ سرینگر کشمیر

طبع اوّل .... اپریل ۱۹۸۱ء

تعداد .... ایک ہزار ۱۰۰۰

مطبع الہ آباد لیتھو گرافرس اینڈ پرنٹرس تھارن ہل روڈ

ناشر ...... مرزا پبلکیشنز حسن آباد، رعناواری سرینگر ۳ کشمیر ۱۹۰۰۰۳

کتابت ...... سیّد ممتاز حسین. مہدی گنج. لکھنؤ

قیمت پندرہ روپے =/15

(ملنے کا پتہ)

۱۹۰۰۰۱

۱۔ میسرز حاجی کلو اینڈ سنز متصل ہنومان مندر، امیرا کدل سرینگر کشمیر

۲۔ اردو پبلشرز۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

۳۔ مکتبہ رفتار۔ راج تلک روڈ۔ جموں توی۔ ۱۸۰۰۰۱۔

فہرست

انتساب

ان سایوں کے نام

جو

روشنی کے محتاج نہیں

عرضِ ناشر

اپنے قارئین کی خدمت میں حسن ساہو کا افسانوی مجموعہ لبستی لبستی صحرا صحرا پیش کرتے ہوئے مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ حسن ساہو ان لکھنے والوں میں سے ہیں جن کے ہر افسانے کے پیچھے ایک زندہ حقیقت کارفر ہوتی ہے۔ وقت کے بہاؤ نے زندگی کے دریا کو اس سنگستان تک پہنچا دیا ہے جہاں ہر پتھر اپنی ایک الگ دنیا رکھتا ہے۔ مگر اس علیحدگی کے باوجود پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کی آواز ہر وقت ایک باہمی رشتے کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ یہی اعلان ان کہانیوں کی روح ہے۔ ان کہانیوں میں پیش کی گئی زندگی دریا کی طرح رواں دواں ہے۔ مگر سنگستانوں میں سے گزرتے ہوئے اس کی موجوں میں جو تلاطم پیدا ہوتا ہے وہی اس زندگی کا سرمایہ ہے۔ دور کنارے سے تماشا کرنے والے ان سے شاید محظوظ نہ ہوں زندگی کرنے والے تماشائی نہیں مسافر ہوتے ہیں۔ یہ کہانیاں اگرچہ

بہت پہلے لکھی گئیں ہیں مگر ان میں پیش کئے جانے والے مسائل اب بھی تازہ ہیں۔ افسانے کے سفر کے اعتبار سے یہ کہانیاں منزلوں پیچھے ہیں لیکن انھیں زندگی کی ہمسفری حاصل ہے انہیں جو زندہ رکھے گی۔ ہم امید کرتے ہیں کے "پھول کا ماتم" کی طرح افسانوی دنیا میں اس مجموعے کی بھی پذیرائی ہوگی"۔

مخلص

جی ایم مرزا

مالک مرزا پبلکیشنز۔ سرینگر

پیش گفتار

پھول کا ماتم، کے بعد، بستی بستی صحرا صحرا، آپ کی خدمت میں پیش کر کے آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ "پھول کا ماتم، جس دلچسپی سے پڑھا گیا اس نے میرے حوصلے اتنے بلند کئے کہ دس سال پہلے لکھی ہوئی کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بھی اپنے اندر کسی طرح کا احساس کمتری نہیں پا رہا ہوں۔

اس مجموعے کے بارے میں، میں خود کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ وہ آپ کا منصب ہے میرا نہیں۔ البتہ اتنا عرض کروں گا کہ اس مجموعے کی بعض کہانیاں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں جب ششش و پنج کاشمیری کے نام سے لکھتا تھا۔ ششش پنج کاشمیری ایک غیر شادی شدہ نوجوان تھا۔ جو خواتین کو دور سے دیکھتا تھا اور ان کے مسائل میں دلچسپی لیتا تھا۔ ان مسائل پر وہ کس طرح غور کرتا تھا، ان کا حل اس کے نزدیک کیا تھا اس کا اندازہ ان کہانیوں سے زیادہ اس کنوارے نوجوان کے قلمی نام "ششش و پنج کاشمیری سے بخوبی ہو سکتا ہے ــ حسن ساھو، شادی شدہ انسان ہے جو بخیال خود سب کچھ ہے مگر نہ کنوارا ہے اور نہ نوجوان سے اب دور کے مسائل اس کے نزدیک [illegible] گئے ہیں ـــ

ششِ وپنج کاشمیری سے زندگی گریزاں تھی اور حسن ساہو زندگی سے گریزاں ہے۔

حسن ساہو کی زندگی دفتری الجھنوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے ہر وقت فائیلوں میں سر کھپاتے رہنا کے ہر سرکار کے حضور میں اپنا قلم پیش کرنا روز کا کام ہے۔ لیکن دفتری قلم اور اس قلم میں جس کی زبان سے آپ سے گفتگو ہو رہی ہے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دفتری قلم دوسروں کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ حسن ساہو کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دفتری قلم تربیت یافتہ ہے۔ قوانین کے تابع چلتا ہے اور دوسرا خودرو، اور ناتربیت یافتہ ـــ اس میں کسی استاد کا فیض شامل نہیں اور نہ ہی اس پر کسی ادارے کا سایہ ہے۔ صرف چند احباب محبت ہے جس کی حرارت سے یہ مصروف کار رہتا ہے۔

میں جناب سید محمد رشید صاحب، رئیس آغا صاحب، مرزا امیر علی صاحب (مالک اُردو پبلشرز لکھنؤ) کا شکر گزار ہوں کہ ان کے تعاون سے کتاب کے منظر عام پر آنے میں زیادہ دیر نہ ہوئی۔

جناب جی ایم مرزا (مالک مرزا پبلکیشنز سری نگر) کا شکریہ ادا کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہوں جن کی سعیٔ جمیل سے یہ کتاب آپ تک پہنچ گئی۔"

حسن ساہو

جموں ۲۸ر فروری ۱۹۸۱ء

صبح کا بھولا

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تاریکی چاروں طرف حلقہ کئے ہوئے تھی.... تاریکی اور سناٹا۔ کہیں کہیں کھمبوں پر لگے روشن بلب اس تاریک سیاہ حلقے کا دامن چاک کرتے اور کبھی کبھار کتوں کی بھوں بھوں خاموش و ساکت فضا میں ہلچل مچا دیتی۔ اس خاموشی اور ان تاریک نقوش کو روندتے شیکھر بھاری قدموں کا سہارا لئے حویلی کی طرف چل پڑا.... اپنے گھر کی یاد اسے ستانے لگی ..... سوشیل کی یاد.....

کھٹ کھٹ کھٹ۔

"مالک آپ! اتنی رات گئے" بوڑھا مالی دروازہ کھولے مری مری اور سہمی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا۔

جواب میں شیکھر نے دو سگریٹ لائٹر کی مدد سے سلگائے۔ دونوں کا ایک ایک کش لیا اور ایک سگریٹ چندن مالی کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا "جاؤ تم سو جاؤ۔"

کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ اس نے زینہ چڑھنا شروع کیا چہرے پر افسردگی کے نقوش مترشح تھے...... دالان کے ساتھ والے کمرے میں تھوڑی دیر ٹھہرا رہا پھر سگریٹ کا آخری ٹکڑا پاس پڑی ایش ٹرے کی نذر کیے اس نے کپڑے تبدیل کرنے اور کمرۂ شب باشی کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے کھلا پڑا تھا۔ آویزاں پردے کو لاپرواہی سے ایک طرف کیا۔ پھر تشکیک کی نگاہیں پتھرا گئیں۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ مجسمہ تصویر بن بیٹھا۔ اس کی حالت غیر ہوئی اور پھٹی پھٹی نگاہیں پھر سے کمرے کا طواف کرنے لگیں۔ رامو ہی تھا...... رامو اس کے پلنگ پر خراٹے بھر رہا تھا اور سامنے چارپائی پر سوشیلا مسرت پڑی تھی......

شریک حیات اور نوکر...... وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ اس سے قبل کہ وہ سوچنے سمجھنے کی اہلیت کو کام میں لانے کی سعی کرتا۔ اس کے ذہن میں ایک غیر معمولی قسم کی اناز کی چھا گئی۔ تحت الشعور کی سطح سے لاوا پھوٹ پڑا..... سب کے سب ارادوں پر انتقامی جذبہ سوار ہوتے اسے تڑپانے ترسانے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنی اس حالت پر قابو نہ پا سکا۔

"کمینہ۔ بدذات۔ نوکر رکھنے کا یہ صلہ مل رہا ہے۔ میرے ٹکڑوں پر پلا آج میری ناموس کی چادر کو داغدار کرنے میں منہمک ہے۔ میں اس نمک حرام کا خاتمہ کر دوں گا...... اس کا خون چوس لوں گا"

دماغی وسعتوں میں اس طرح کے دھارے پھوٹے کہ وہ سیدھے بازو پر رکھی ریوالور کو... اپنا الماری نکال لیا۔ معاً اس کا

دھیان چارپائی کی جانب چلا گیا۔ جس پر سوشیل میٹھی نیند سو رہی تھی۔
"چنڈال کہیں کی۔ میری غیر حاضری میں یہ گل کھلانے پر تلی ہوئی ہے۔
تب ہی تو یہ اتنی سادہ بنتی تھی۔ مجھ سے دکھاوے کے لئے پیار جتاتی تھی۔
یہ کمینی اتنی گری ہوئی ہے۔ مجھے خواب میں بھی اس کا خیال نہ تھا۔

رامو نے کروٹ بدلی اور سرہانے سے چمٹ گیا۔ تبھی اس کی حالت اور بھی غیر ہو گئی۔ خشونت اور عتاب کی ملی جلی تصویر بنے وہ دم بخود کھڑا رہا۔ حواس بکھرتے گئے اور وہ کچھ بھی فیصلہ نہ کر پایا۔ ہر طرح کی اہلیت اس سے دور ہو رہی تھی .... ان ہی خیالات نے دماغ کو مفلوج کر دیا اور اس پر دونوں کو ختم کرنے کی دھن سوار ہو گئی .... ریوالور کا گھوڑا دبانے سے پہلے اس نے سوشیل کی طرف پھر دیکھنا شروع کیا جو جمائی لے رہی تھی اور پھر پاس ہی دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر نظریں جم گئیں جس پر معصوم بچے کی تصویر بنی تھی .... معصوم .... بے گناہ .... بے داغ .... جبیں کا رواں رواں پاک و لطیف ترجمان پڑتا تھا۔ وہ انگوٹھا جو سینے میں مچا تھا۔ تبھی اُسکو اس بچے کا خیال ستانے لگا۔ جو سوشیل کی کوکھ میں آج آٹھ مہینوں سے پل رہا تھا .... اس کی حالت پھر سے غیر ہونے لگی۔ آشوب پدری پھر سے اپنا رنگ جمانے لگے .... ذہن کی گود میں ابلیس کے ہتھکنڈوں نے اقرار کو پیا کر دیا .... "نہیں یہ میرا بچہ نہیں ہو سکتا .... یہ کیسے ممکن ہے۔ اس بچے کو بھی زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ یہ میرا بچہ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔ اب اس میں گنجائش نہیں رہی ......

میں ..... میں ان دونوں کو مار ڈالوں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کی میٹھی نیند سلا دوں

گا۔ تا کہ کل کو میرے نام پر کوئی کالک نہ پوت دے"۔

تیسکھر کی ساری قوتیں جیسے سلب ہو چکی تھیں ..... وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا ...

دماغ اور دل پر تخریبی بھوت سوار تھا ..... اس نے ریوالور کے گوڈے پر

انگوٹھا جما دیا ..... گوڈ دبانے کو ہی تھا کہ بدحواسی اس پر چھانے لگی۔ سارا کمرہ

اُسے رقص کرتا دکھائی دیا۔ ہر چیز گھومنے لگی۔ پلنگ ..... چارپائی ... کلنڈر

..... بچہ ..... کمرہ روشن ہوتے ہوئے بھی اسے تاریک جان پڑا۔ ہوش و حواس

کی سطحوں پر یہ بدحواسی قبضہ جما گئی۔ اور سارا جسم جیسے سن پڑ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

جیسے اس میں قوت نہ تھی۔ ایک وجدانی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ اس سب کی

وجہ وہ خود بھی نہ جان سکا۔ جان سے مار ڈالنے کا جذبہ سرد پڑ گیا۔

"تم ابھی تک کہاں تھے"۔ تیسکھر چونک پڑا۔

"میں پوچھتا ہوں تم خود اتنی رات گئے تک کہاں تھے"۔

اس کے تحت الشعور میں غیر معمولی کھلبلی چھا گئی۔ نہایت کوفت و اضطراب کے

انداز میں اس نے اِدھر اُدھر جھانکا۔ کوئی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کوئی کمرے میں

تھا۔ لیکن آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں یہ سوال برابر غوطے کھا

تھا۔ خوفزدہ عقاب کی طرح دیوار سے چپاں ہوا۔

"تم نہیں بتاتے تو میں بتائے دیتا ہوں"۔ اب کی بار تیسکھر جان گیا کہ آ

خود اس کے اندر سے آ رہی تھی۔

"تم خود کمینے ذلیل اور قزاق ہو اور پھر دعویٰ انسانیت کر رہے ہو۔

تمھاری ہر حرکت سے واقف ہوں...... میں ہردم تمھارے ساتھ رہا کرتا ہوں۔ ہر ایک کو...... شیشیلی کو...... اس حویلی کو محلے کو ......اور اس دنیا کو تم دھوکہ دے سکتے ہو مگر مجھے نہیں...... میں تو تمھارے ہی وجود کا دوسرا روپ ہوں...... کیا تم نے دس راتیں اس گھر سے باہر نہیں گزاریں..... جواب دو...... زبان پر تالے کیوں پڑ گئے۔ کملا تمھارے لئے بہن سے کم نہ تھی۔ لیکن تم نے اس کی عزت سے کھیلنا کوئی گناہ خیال نہیں کیا.... افسوس تم پہ..... تمھارا انسان ہونے پہ اور تمھاری مروت پہ..... تم انسان نہیں، حیوان سے بھی بدتر ہو — تم وحشی ہو۔ درندے ہو......"

تیکھر کے ہاتھ سے ریوالور گر پڑا۔ اسے اٹھا کر وہ سرعت کے ساتھ باغ والے کمرے میں گھسا اور آرام کرسی کا سہارا لئے سگریٹ کا کش لگانے لگا۔ ....اس کے دماغ میں ہیجان سا پیدا ہو رہا تھا۔

"تم انسان نہیں حیوان ہو"

"تم انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہو —

"تم نے انسانیت سے سرکشی اختیار کر لی ہے۔

"تمھاری حیثیت اس پاک و پوتر دھرتی پہ ایک رستے ہوئے ناسور سے کچھ کم نہیں"

"تم معاشرے کی چادر پہ بدنما داغ ہو اور سماج کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ

"تم انسان نہیں ......ہو"

اندر کے انسان نے شیکھر کو ستانا شروع کر دیا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی۔ شعلہ سا بھڑکا۔ فہم و شعور کی دیوار دل پہ کوئی ہتھوڑے مارنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے پردے نم آلود ہونے اور گزشتہ دنوں کے کارنامے اس کے سامنے رقص کرنے لگے۔ شیکھر دیکھتا گیا۔ ایک ایک حرکت اس کے رُوبرو منڈلانے لگی ــــــ

اشوک شیکھر کا قلمی دوست تھا اور مراسلت کا سلسلہ کئی سال سے جاری تھا۔ وہ اپنی بیوی کملا کو چند روز کے لئے شیکھر کے پاس چھوڑنے کی خواہش ظاہر کر گیا تھا کہ شیکھر کے اٹھتے بیٹھتے چہرے پر لالی اپنے ہونے کا اعلان کرنے لگی۔ اشوک فوج میں بھرتی تھا۔ کملا کو اسٹیشن پر شیکھر کے حوالے کرتے ہوئے وہ نیپال چلا گیا۔ تاکہ مزید چھٹی حاصل کرکے اپنی شریک زندگی کو کشمیر کی سیر کرا سکے۔

شیکھر نے دوست کی امانت کو گھر لانے کے بجائے نواحی ہوٹل میں کمرہ لیا اور وہیں ٹھہرا دیا۔ اور پھر اس سے راہ و رسم بڑھانے لگا۔ میل ملاپ بڑھ گیا۔ رات تو رات دن کا بیشتر حصہ بھی وہ کملا کے ساتھ گزارنے لگا۔ دفتر سے واپسی پر سوشیل کے ساتھ چائے پینا اور پھر لباس درست کرکے ہوٹل کی جانب رجوع ہو جانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ تھیٹر .... سینما اور کلب کملا کو اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے۔ کملا اس خاطر کہ اس کے خاوند کا دوست ہے اور شیکھر اس خاطر کہ کملا ایک پُرپھبک اور پُر کشش کلی تھی۔ ہر نئے اور تازہ پھول کو دیکھ کے نہ جانے مرد کی رال کیوں ٹپکنے لگتی ہے؟

اور پھر شیکھر بھی تو مرد ہی تھا۔

"ناتھ! آپ رات بھر باہر رہا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ؟ پہلے تو آپ نے کوئی رات باہر نہیں کاٹی"۔

ایک دن سوشیل صبر و ضبط کے حدود کو پار کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ اور جواب میں شیکھر نے کہا۔

سوشیل! دراصل بات یہ ہے کہ میں رات بھر کام کرنے لگا ہوں۔ نواحی ہوٹل میں رقم لگا دی ہے۔ اس کام میں بڑا فائدہ رہے گا۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں کا کام ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں۔ تیرے اور ہونے والے بچے کے لئے ہی کر رہا ہوں۔...."

"ناتھ تمھارے بغیر تسکین حاصل نہیں ہے" سوشیل نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمھارے نہ ہونے سے اس حویلی کی ہر چیز مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے"۔

اس کا جواب دئیے بغیر شیکھر چل پڑا تھا۔ اپنے ٹھکانے پر.... انسان سے حیوان بن جانے کے لئے۔ وہ کملا کو طرح طرح سے آرام پہونچانے لگا۔ لیکن اس نے شیکھر کی ہر ناپاک حرکت کو خوش اسلوبی کے ساتھ زیر کر دیا۔ کملا کو اس سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس کے باوجود ہر وار کا جواب وہ کامیابی سے دیتی گئی۔ لیکن اس روز جبکہ بستر علالت پر بوجہ سر درد کے وہ دراز پڑی تھی۔ وہ شیکھر کے ہتھکنڈوں سے بچ نہ سکی۔ اس نے دوائی کے بدلے کوئی نشیلی چیز کملا کے حلق میں انڈیل دی۔ اس نے کملا کے ہوش و حواس پر پردہ ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ تاریکی اور سیاہی کی۔ وہ بے حس تھی اور شیکھر نے من کی پیاس بجھا دی۔ اس نے کملا کی بے ہوشی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جنسی بھوک کو مٹا دیا۔ اس نے

نہ صرف ایک عورت کی عزّت پر ڈاکہ ڈال دیا بلکہ کسی کے اعتماد کا خون بھی کر دیا۔
.....اب تو روزانہ یہ عمل دُھرانا اس نے اپنا فرض اوّلین جان لیا۔۔۔۔۔
وہ ہر طرح سے کملا کی خاطر داری کرنے لگا۔ رات رات بھر وہ انسانیت و شرافت
کے دامن کو تار تار کرتا گیا......سوشیل سے الگ......کوکھ میں پڑے
معصوم جان سے نظریں بچا کے اس ماحول سے دور۔ جہاں اس کا خیال تھا کہ
کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ بھگوان کو بھی وہ بھول گیا تھا......ہر طرح کی خاطر
داری میں اس نے روپیہ پانی کی طرح صرف کر دیا.......سیر اور تفریح،
اور پھر بازار سے چیزیں خریدنا......وہ بھول گیا تھا کہ وہ کسی کا گھر والا
ہے.....کسی کا آسرا ہے......وہ سب کچھ فراموش کر گیا جیسے وہ کسی
کا نہ تھا اور اس کا کوئی ایک نہ تھا..نشہ آور دوا کے سہارے وہ کملا کے
جسم سے کھیلتا رہا۔ کملا کو اب اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔
عورت ذات جو تھی......عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہوا کرتی ہے۔
کہ وہ عورت ہے......پھر بھی نہ جانے کیوں وہ نشیلی دوا میں دل چسپی لینے
لگی......اسی دوران کملا نے اکثر کئی بار سوشیل سے ملنے کی خواہش ظاہر کی
لیکن ہر بار شیکھر حسین تحفے چھوڑ کر اس کو ٹالتا رہا......وہ خود شیکھر کے گھر تک
آئی بھی تھی۔ لیکن شیکھر نے مالی چندن سے کہلایا کہ سوشیل میکے چلی گئی ہے...اور
پھر آج شیکھر سینما چھیٹے پر کملا کے ساتھ کلب کی دعوتوں میں کھونے لگا۔ جو کہ اب کی
زندگی کا اہم جز بن چکا تھا۔ ان دس دنوں میں وہ کتنا آزاد خیال بن چکا تھا...

....کلب کی رنگینیاں.....ایک جوڑا.....دوسرا.....تیسرا.....کملا کی کمر اور

اس کی باہیں ..... ہونٹوں کا تصادم..... بازوؤں کے حلقے تنگ ہوتے چلے گئے۔ کمر سمٹنے لگی..... رقص کا بازار گرم تھا..... ہونٹوں کی لالی ختم ہو رہی تھی..... قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اور پھر کلب ہال میں اندھیرا..... عجب سماں تھا..... نصف رات کے قریب ہوٹل میں گھسنے پر انھیں علم ہوا کہ اشوک دیر کا آیا ہوا ہے۔ دفعتاً شیکھر کے پاؤں اکھڑ گئے... سکتہ سا طاری ہوا۔ ساری بشارت جواب دے گئی۔ وہ اشوک سے ملے بغیر واپس لوٹا۔ اس کے دل و دماغ میں چور جو تھا۔ وہ کیونکر اشوک کے قریب جاتا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو چلی اور ہوٹل سے باہر قدم رکھا تو خوفناک اندھیرا اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ زندگی کا کارواں لٹ گیا..... کارواں چلا گیا..... وہ اکیلا رہ گیا..... کملا پھر خیالوں میں ابھری..... اور پھر ہزاروں کملائیں ابھریں۔ سب کچھ اس کے سامنے تھا۔

"چوروں کی طرح کیا کر رہے ہو؟ جانتے نہیں اس طرح راتوں کو پھرنا ممنوع ہے" یہ پولیس کا گشتی فرد تھا۔

شیکھر چونک پڑا۔ اور سارا سلسلہ ٹوٹ پڑا۔ ناچ ختم ہوا۔ کلب کی دنیا سو پڑی۔ تھیٹر کی گہرائی سمٹ گئی..... اور وہ کھمبے سے جدا ہوتے ہوئے چلتا بنا۔

"انساں یہ سچ ہے۔ حرف بہ حرف سچ۔" شیکھر چلا اٹھا! اس کی حالت غیر تھی۔ اندر کے انسان نے اس کو بری طرح زیر کر دیا تھا۔ اس میں اب بولنے اور سرگستی کرنے کی طاقت بھی نہ تھی۔ اس کی حالت زندہ لاش سے کم نہ تھی۔ سگریٹ کے تاریک دھوئیں سے کرنے کا یا... اٹھتا... کچھ سوچ رہا تھا کہ ...

کی آندھی چلی۔ تیکھر کی حالت بھی اس گرد و غبار سے کم نہ تھی...... چھپی ہوئی اور دبی ہوئی غلاظت پھر سے اُبھر کر اس کے سامنے آگئی تھی...... اندر اور باہر طوفان!

سامنے والی کھڑکی بند کرنے کی غرض سے اٹھا ہی تھا کہ مانوس آواز نے اس کے بے سُدھ کانوں کے پردے ہلا دیئے۔

"رامو، او رامو" یہ سوشیل کی آواز تھی۔

"جی مالکن ـــ؟

"آندھی چل رہی ہے کھڑکیاں بند کر دو"۔

رامو کے بستر سے اٹھنے اور جھروکے بند کرنے کی آوازیں صاف سنائی دیں...... شیکھر کی حالت پھر سے پتلی ہو پڑی...... وہی انتقامی وہی تخریبی جذبہ ابھرنے لگا۔ وہ اپنی کہانی بھی بھول گیا...... سب کچھ......

"مالکن اب میں جاؤں؟ رات کافی بیت چکی ہے"۔ شیکھر چونکا یہ رامو تھا...... خاموشی......

"مالکن مجھے اب اجازت دو"۔

"کیا ہوا تمھیں؟ روز بروز ضد کیوں کرتے ہو؟ بچوں کی طرح"۔

"مالکن نہ جانے آپ کو کیا سوجھی ہے؟ ذرے کو آفتاب بنانا بے عقلی ہے۔ میرے لئے فرش پر بچھی چٹائی موزوں ہے۔ سچ کہتا ہوں یہ پلنگ میری جگہ نہیں۔ یہ تو مجھے کانٹوں کا انبار لگ رہا ہے۔

مالکن مجھے اپنی قدموں میں جگہ دو۔ میں فرش پر سو جاؤں گا جو میرے

لئے مناسب جگہ ہے۔"

راموگڑگڑایا۔

"تمھیں ہوا کیا ہے راموا سو جاؤ پلنگ پر بکواس کئے بغیر .... دیکھو رامو۔ میں آج تمھیں بتائے دیتی ہوں کہ پلنگ پہ سونے کے لئے میں تمھیں مجبور کیوں کرتی ہوں..... یقیناً یہ حقیقت جاننے کا اشتیاق تمھارے دل میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوگا...... تمھیں علم ہے کہ اس (شیکھر) کے بغیر مجھے ایک پل آرام حاصل نہیں۔ نہ قرار سے واسطہ ہے۔ پہلی دو راتیں میں نے اسی طرح گزار دیں۔ مگر آنکھوں آنکھوں میں..... رات کو جاگنے پہ میری نظریں اس پلنگ پر جو کو نہ ہو جاتی تھیں۔ اور اسے نہ پاکر وحشت زدہ ہوتی تھی۔ تڑپتی تھی اور سسکتی تھی... یاد ہے اس رات میں کتنی سہمی سہمی اور دہشت زدہ تھی جب تمھیں بلا کے پلنگ پر سونے کو کہا....."

"یہ سب درست ہے مالکن.... پھر بھی تمھارے قدموں میں سونے میں کیا حرج ہے؟"

"پگلے! اتنا بھی نہیں جان سکتے۔ میں یہ پلنگ خالی نہیں دیکھ سکتی۔ رات کو بسا اوقات آنکھیں کھلنے پر میں پلنگ کو گھورا کرتی ہوں۔ اور یہ تسلی کرکے کہ پلنگ پر کوئی سوتا ہے۔ آرام سے سو جاتی ہوں۔ رامو میں سچ کہتی ہوں جب تم اس پلنگ میں پوری طرح چھپ جاتے ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا مالک میرے پاس ہے اور میں پھر سے عالم خواب کی سیر کرنے لگتی ہوں .... میں راموا سی خاطر تمھیں تکلیف دے رہی ہوں جب تک اس کا کام ختم نہ ہوگا تمھیں میرے پاس ہی سونا

ہوگا۔ اسی طرح سے ۔۔۔۔ رامو تم میرے بھائی کے برابر ہو۔ کیا اپنی بہن کے لئے اتنا بھی نہ کروگے۔"

"مالکن!" اب کی بار رامو بچوں کی طرح ٹھاٹھا کر کے رونے لگا۔

"رامو! کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہے ہو؟"

"مالکن سوچتا ہوں چھوٹا منھ بڑی بات نہ ہو جائے۔"

"بتاؤ رامو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ بتاؤ! مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

"مالکن! شیکھر بابو کو میں نے پرسوں ایک انجان لڑکی کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو بتانا مناسب نہ جانا۔ وہ دونوں آپس میں خوب۔۔۔۔۔"

اس سے پہلے کہ رامو فقرہ مکمل کر لیتا "تڑاخ تڑاخ" کی آوازیں گونج گئیں۔

"ذلیل! کمینے!! نکل جا میرے کمرے سے! تمھاری اتنی جرأت کہ میرے سرتاج و سہاگ کے خلاف زبان کھولو۔ میرے سہاگ پر تہمت لگاتے تیری زبان جل کیوں نہیں گئی۔ میرا پتی اس طرح کا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔

یہ سب جھوٹ ہے۔ جس کے ٹکڑوں پر پلتے ہو اس سے یہ غداری۔۔۔

ذلیل! میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ تم نے ایک عورت کی عزت کو للکارا ہے۔ اس کی غیرت کو للکارا ہے۔"

بپھری شیرنی کی طرح روشنی رامو پر جھپٹ پڑی۔ وہ اپنے شوہر کے خلاف کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔

"شیکھر سب کچھ سن رہا تھا اس کی حالت میں ارتعاش سا آگیا۔۔۔۔

۔۔پتھر کی مورتی میں جیسے جان آگئی۔ اس کا اندر کا انسان باہر کو آرہا تھا۔۔۔ وہ غفلت کی نیند سے جاگ چکا تھا۔ اس کے حواس پر سے چادر ہٹ چکی تھی۔ اندر کے انسان کے جاگ جانے اور باہر آنے سے شیکھر میں بلا کی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے دماغ اور دل پر بوجھ یک لخت آن پڑا۔ جو اس سے قبل اندر کا انسان اٹھائے ہوئے تھا۔۔۔۔۔ شیکھر نے اس ثقیل بوجھ کو ہلکا کرنا چاہا۔۔۔۔۔ اس سے رہا نہ گیا۔ دوڑ کر سوشیل کے پاؤں پر ڈھیر ہو گیا۔ جو رامو کا گلا دبائے ہوئے تھی۔

"سوشیل تم دیوی سے بڑھ کر ہو مجھے معاف کر دو۔ رامو نے ٹھیک کہا ہے۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہی کہا۔ دیوی! میں اتنا بہک گیا تھا۔۔۔۔ ہاں میں اتنا بہک گیا کہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔۔۔۔ تمھیں بھی گیا تھا۔ تمھاری محبت کو بھول گیا۔۔۔۔ اس چار دیواری۔۔۔۔ اس پلنگ اور اس ماحول کو بھول گیا تھا سوشیل! یقین جانو مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کر لیا۔ سوشیل مجھے معاف کر دو۔"

سوشیل نے رامو کی گرفت چھوڑ دی! شیکھر برابر کہہ رہا تھا۔۔۔۔ "میں کتنا کمینہ ہوں! جھوٹا ہوں! میں نے تم سے جھوٹ کہا کہ میں نے ہوٹل میں روپے لگا دیئے اور رات بھر کام کرتا ہوں۔ میں نے سب رقم برباد کر دی ہے۔ عیش و عشرت کو اپنایا، انسانیت سے گر کر حیوانیت سے ناطہ جوڑا۔ ہاں میں نے حیوانوں کے شراب خانوں اور بدقماشوں کی بستی میں گھس کے انسانیت و شرافت کا نیلام کر دیا۔ میں پشیمان ہوں۔ اپنے کئے پر۔۔۔۔۔ میں ان مقدس پیروں کو چھو کر قسم کھاتا ہوں کہ ایسا کبھی بھی [illegible] نہ کروں گا۔۔۔۔

جس کے گرنے سے تمھیں اور انسانیت کے اصولوں کو دکھ پہونچے ..... سوشیل
اپنے اپرادھی پر رحم کھاؤ ..... میں بہت گر چکا ہوں۔ پستی میں جا پڑا ہوں
..... اس سے نکال باہر کرنا اب تمھارا کام ہے۔ مجھے باہر نکال دو۔"

سوشیل کی ہچکیاں بندھ گئیں تھیں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا دماغ درد و اندوہ کی اچھی خاصی جھیل بن چکا تھا ...... وہ تھرتھرا اٹھی۔ یاس و حسرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اور لرزتے ہاتھوں سے اپنے پتی کو قدموں سے جدا کرتے ہوئے اوپر اٹھایا جو اوندھے منھ پڑا تھا۔ اس کی زبان خود بخود کام کرنے لگی۔

"ناتھ! اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ ابھاگن کے بھاگ ہی ایسے ہیں۔ اگر میرے معاف کرنے سے ہی شانتی ملتی ہے تو میں نے تمھیں معاف کر دیا۔"

دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ دونوں جسم ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ اور ایک دوسرے کے کندھوں پر سر ڈالے رونے میں مشغول تھے ...... پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور [illegible] رہے تھے۔ محبت کا لاوا آنکھوں سے پھوٹ پڑا تھا۔ نفرت کے جراثیم قوت کھو رہے تھے۔ محبت کی گرفت بڑھ رہی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے شکایت تھی۔ مگر اب شکوہ و شکایت کی جگہ الفت کے پیمانے چھلک رہے تھے ...... پیار کی گرفت نے دونوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے لئے صاف کر دیا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک ایک دوسرے کے [illegible] کو سنبھالتے [illegible]

گٹھری لئے وارد ہوا۔

رامو جو بے حس و حرکت کونے میں پڑا بھگوان کی لیلا دیکھ رہا تھا......
اٹھا اور گٹھری سامنے رکھے لفافہ شیکھر کے ہاتھوں میں تھما دیا...... پیار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ آنسوؤں کے دھارے رک گئے اور شیکھر نے لفافہ چاک کر دیا۔ لفافہ اشوک کا تھا جس میں لکھا تھا:۔

اپنے شیکھر!

جانے کیا بات ہے کہ تمہاری بھابی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ رات کو سوشیل کے ساتھ سینما گئی تھی دیر سے لوٹی اور ضد سوار ہے کہ میں اسے گھر واپس لے چلوں۔ تم اور بھابی سے ملے بغیر آج صبح کی گاڑی سے سب پروگرام منسوخ کر کے گھر واپس جا رہا ہوں۔ یہ ایک مہینہ گھر میں ہی کاٹوں گا۔ کملا کے ساتھ....

ہاں تو کپڑے اور زیور میں بھیج رہا ہوں یہ سب چیزیں سوشیل بھابی نے کملا کے ساتھ خرید کے اس کے پاس رکھی تھیں۔ تمہیں یہ چاہئے تھا کہ فالتو وقت میں بھابی کی ضروریات پر دھیان دیتے لیکن تم بڑے آدمی ہو نا۔ اس خاطر اسے ساتھ لے جانا خلافِ شان سمجھتے ہوں گے۔ کملا کے کہنے پر یہ چیزیں بھابی کو دینے کے لئے بھیج رہا ہوں۔ بقچے میں آسمانی رنگ کی ساڑھی ملے گی۔ یہ میں نے بھابی کے لئے لی ہے۔ اسے میری طرف سے دیدینا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اور بھابی سے ملے بغیر جا رہا ہوں۔ ہوٹل کا بل میں سے

ادا کر دیا ہے۔ شکریہ:

تمھارا۔

اشوک

شیکھر سب کچھ پڑھ کے بھی کچھ نہ جان سکا...... یہ کیا ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ لفچہ اور خط اس نے چاہا تھا کہ سوشیل کی نظروں سے بچا رکھے لیکن اب چونکہ اندر کا انسان سب کچھ خود ہی کہہ رہا تھا...... وہ اس پر غالب مکمل طور سے آیا تھا۔ وہ نہ مانا۔ وہ اب ابدی جاگرتی حاصل کر گیا تھا۔ لفچہ و خط سوشیل کے سامنے پلنگ پر رکھ کے خود بغل والی بیٹھک میں گھس گیا اور رسالے و اخباروں کی ورق گردانی کرنے میں مصروف ہو گیا...... دن تو پر ورق الٹتا گیا......

"چائے پی لیجیے"۔

وہ چونک پڑا۔ سامنے سوشیل کھڑی تھی۔

"بیٹھیے"۔

شیکھر کے کچھ کہنے سے پیشتر سوشیل کی زبان کام کر گئی۔ "مجھے معاف کرنا پتی دیو۔ میں نے تمھارے ساتھ زیادتی کی" اور دونوں غیر ارادی طور پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جیسے بچے گڈے گڈیوں کا کھیل رچاتے ہیں، روٹھتے، بگڑتے اور پھر خود بخود آپس میں شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ وہ ہنس رہے تھے اور سامنے کا مونٹ ایجوان کا شکر ادا کر رہا تھا کہ گھر اجڑتے اجڑتے بچ گیا!

اندھیرے میں روشنی

آدھی رات گئے چوراہے کے موڑ پر بدنصیب اور مفلس رام سے اس کی ملاقات ہوگئی تو اس نے رام سے کہا۔

"جاؤ اگر داؤ لگانا چاہتے ہو تو ٹھیک اسی راستے سے مشرق کی طرف چلے جاؤ۔ کچھ دور جانے پر ایک چھوٹا سا بنگلہ نظر آئے گا۔ اس کے اردگرد باغ ہے۔ اور اس کی دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے۔ اس وقت اس بنگلے میں بوڑھے مالی کے سوا کوئی نہیں۔ جو دو دن سے بخار میں تپ رہا ہے۔ ایک کتا تھا کئی روز ہوئے وہ بھی مر گیا ہے۔ جاؤ رام ایسا موقع کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ سمجھیں۔ ایک سانس میں وہ اتنا سب کچھ کہہ گیا۔

رام نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ اپنا پر شکن دامن درست کرتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا مشرق کی طرف چل دیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پل تھا۔ اس کے نیچے سے صاف وشفاف پانی زمین کی چھاتی کو چیرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ پل کے اس پار تاریک اور گھنا جنگل تھا۔ سنسان اور ڈراؤنا جس پر قبرستان کی سی بھیانک اور ڈراؤنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی انسان نہ

کہیں نظر نہ آتا تھا۔ تاریک رات اور پھر غضب کی سردی۔ ظالم سردی سے اس کا بدن لرز رہا تھا۔ اُس کے بدن پر صرف ایک شکستہ 'دریپونہ' لٹکا کرتا تھا — اس نے اپنا منہ کانوں کی لوئیں تک کرتے کے کالر میں چھپا لیا۔

رام چل رہا تھا یوں جان پڑتا تھا جیسے کوئی سایہ سرکتا جا رہا ہے ہر طرف سکوت تھا۔ اور خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ نرم اور ملائم گھاس پر چلنے سے اس کے قدموں کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔

رام کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مرجھائی ہوئی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بڑے اندوہناک مصائب جھیلے ہیں۔ اس کے مُردہ چہرے پر رونق، شادابی، اور تازگی کا نشان تک نہ تھا صرف آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ جن سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل کی تمام گرمی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہو۔ اس میں اور دوسرے غریبوں میں یہی فرق تھا۔

وہ جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر وہ بنگلہ نظر آیا۔ اسکے عین مقابل وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں اندھیرے میں گاڑ کر دیکھا کوئی نہ تھا۔ اطمینان ہونے پر رام کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زمین و آسمان بلکہ ہر چیز اس کی ملکیت ہے۔ کوئی اور اس کا مالک نہیں۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا۔ اس وقت سب چیزیں میری ہیں۔ مگر یہ میرے پاؤں کیوں آگے نہیں بڑھتے۔ میرے ہاتھ کیوں نہیں اٹھتے۔ کون اس کام میں مخل ہو رہا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ میرے سب کے سب ارادے ماند پڑنے لگے ہیں۔۔۔۔

... میری ٹانگوں میں جیسے چلنے کی سکت نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ ناقابل برداشت بھوک سے تنگ آکر رام نے کسی کے باغ میں جا کر پھل توڑ کر ضرور کھائے تھے لیکن کبھی نقب یا قفل توڑ کر چوری نہیں کی تھی۔ یہ اس کی پہلی چوری تھی۔

بستی میں کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا، کچھ دینا تو درکنار کوئی جھوٹے منہ پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ اکثر صبح سے شام تک فاقے سے رہتا کوئی اسے ایک نوالہ دینے والا نہ تھا۔ جاڑا ہو، برسات ہو یا گرمی وہ دن رات کسی درخت کے نیچے پڑا رہتا۔ اس وقت کوئی راہگیر اس کے ساتھ بات بھی نہ کرتا تھا۔ وہ تھا اور اس کی بے بسی۔ اور اگر کوئی تھا تو وہ تھی تنہائی جس کا وہ خوگر ہو گیا تھا۔

کافی عرصہ پہلے جب رام والدین کو کھو کر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس وقت گاؤں کے ایک بوڑھے آدمی نے اسے گھر بلایا تھا اور بوڑھے راجو نے بڑی محنت سے اسے رسیاں اور ٹوکریاں بُننا سکھایا تھا۔ لیکن اس کام سے اس کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ اس کی طبیعت لاابالی تھی۔ ایک جگہ قیام کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے ڈانواڈول دل لئے اِدھر اُدھر پھرا کرتا۔

ایک دن شام کے وقت ایک لڑکی سے باغ میں اس کی ملاقات ہو گئی۔ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ رمیا گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے باغ سے واپس جا رہی تھی۔ اور رام کنج میں بیٹھا پھل کھا رہا تھا۔ وہ کوئی حسین و جمیل لڑکی نہ تھی۔ لیکن اس کی شکل و صورت میں کشش ضرور تھی۔ افسردگی اور غم نے اسے اور بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ دوسری خصوصیت جو دونوں میں مشترک تھی تو وہ یہ کہ دونوں یتیم تھے

تھے۔ ترک وطن کے دوران میں رمیا کے سر سے بھی والدین کا سایہ اٹھ گیا
تھا اس کا بھی کوئی ہمدم، کوئی مونس اور کوئی غم گسار نہیں تھا۔ وہ بے چاری
نوکری کر کے یا کبھی کبھی گھاس بیچ کر گزر اوقات کرتی اور صرف پیٹ کی آگ
بجھانے کے لئے اسے دن بھر سخت محنت کرنا پڑتی۔ کبھی چودھری کے گھر جا کر
برتن مانجھتی۔ کبھی کسی کے یہاں صفائی کرتی اور پھر دن بھر ڈھلوان پہاڑی پر
گوبر جمع کرنا اور اوپلے بنا بنا کر دن کا بیشتر حصہ وہیں گزار دیتی۔ واقعی دونوں بدنصیب
ایک دوسرے سے ملے تھے۔ اس لئے ان دونوں کو ایک دوسرے سے
محبت ہو جانا فطری بات تھی۔ اب وہ ہر روز ملا کرتے تھے۔ اور دنیا والوں کی نظروں
سے دور محبت کو امر رکھنے کے لئے عہد و پیمان باندھا کرتے۔ آخر اس شہر
سے دونوں چلے گئے۔ تاکہ انھیں طعنوں اور تشنوں سے لوگ نہ نوازیں۔ دور
جا کر انھوں نے شادی کر لی۔ نوخیز اور معصوم دلہن اپنے مفلوک الحال اور خصائص
پن سے لبریز دولہا کے ساتھ ساتھ گنگناتی اور مسکراتی پھرا کرتی۔ دونوں صحراؤں
اور ننگے میدانوں میں گرمی اور سردی کی تکلیف برداشت کیا کرتے۔ انھیں
دونوں وقت کھانا پیٹ بھر نصیب نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب دونوں میں سے کوئی
بھی مغموم نہ تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت میں اس قدر خوش تھے کہ
ان کو کسی بھی تکلیف کا احساس و غم نہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کی رفاقت
ہی ان کے لئے خوشی اور شادمانی کا باعث بنی ہوئی تھی وہ یقیناً اس بدحالی
میں بھی خوش تھے جیسے ان کے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ گیا ہو۔

دن گزرتے گئے [illegible] عرصہ کے بعد چاند جیسے بچے کا اضافہ ان کی جھونپڑی

میں ہوا۔ بچّہ اس قدر حسین اور ذہین تھا کہ ایک غریب کی جھونپڑی میں اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ بھگوان نے رام اور رمیا کو اولاد کیا دی کہ ان کے ہاتھ میں بے پایاں دولت آگئی۔ ان کی خوشی اور مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اتنی عمر انھوں نے مشکلوں اور سختیوں میں بسر کی تھی۔ لیکن موہن کو پاکر وہ اپنے تمام دُکھ درد بھول گئے۔ اب انھیں کسی چیز کی فکر اور پروا نہ تھی۔ ان کے دل میں اب کوئی تمنا نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ موہن ان کے پاس رہے۔ موہن کو پاکر ان کی ہر آرزو ہر خوشی پوری ہوگئی تھی۔ اب انھیں اگر کوئی ارمان تھا تو وہ یہ کہ سوہن جلدی بڑا ہوجائے اور پھر ان کی غریبی کی عمارت اپنے کماؤ ہاتھوں۔ کرکے رکھ دے۔ جس عمارت نے عرصہ سے انھیں اپنے اندر مقید کر رکھا ہے۔ اس سے انھیں چھٹکارا حاصل ہوجائے۔

اب تک رام اور رمیا باغ کی ٹھنڈی ہوا کی طرح آزاد پھر تے تھے انکے نزدیک ایک دوسرے سے محبت کرنے کے سوا زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا لیکن اب اولاد ملتے ہی ان کی دنیا بدل کر رہ گئی تھی۔ انھوں نے کسی حد تک ایک دوسرے کو فراموش کرنا شروع کر دیا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے دلچسپی لینے کے بجائے بچّے میں دلچسپی لینے لگے۔ اب انھیں ہر وقت یہی فکر رہتی کہ دونوں کسی طرح اپنے بچے کو کھلائیں۔ اور اچھا پہنائیں۔ گویا اپنی نسبت کچھ سوچنے سے پہلے دونوں موہن کی بابت سوچنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جیسے دونوں کی مشترکہ خوشی اپنے بچے سے وابستہ تھی۔ جب موہن زندگی کی چار بہاریں دیکھ چکا تو رمیا بستر علالت پر ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی اور رام اور موہن کو سدا کے لیے

چھوڑ کر دور آکاش سے بھی دور چلی گئی۔ جہاں سے واپس کوئی نہیں آسکتا۔ اسوقت سب لوگ رام سے کہنے لگے۔

"تم لوگ رات دن سردی میں مارے مارے پھرتے تھے۔ رمیا بیچاری کا تو انتقال ہو گیا۔ اب اس بچے کو احتیاط سے نہ رکھا تو یہ ننھی سی جان بھی تم سے، روٹھ کر چلی جائے گی۔"

رام نے لوگوں کے مشورے پر توجہ نہ کی۔ بلکہ پہلے ہی کی طرح لاپرواہی سے زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ تو اس زندگی کا خوگر تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ نہ سکا کہ جان کی حفاظت کے لئے کیا کچھ کرنا ضروری تھا۔ اس کے لئے یہ سب باتیں بعید از قیاس تھیں۔ البتہ ایک دکھ رام کو ستائے رکھتا تھا۔ وہ یہ کہ اس کی دُکھ سکھ کی ساتھی اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی زندگی اس سے بچھڑ گئی۔

موہن ہو بہو ماں کی تصویر تھا۔ وہی گھنگھریالے بال، دلکش چہرہ، نیلگوں آنکھیں اسے دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنی رمیا کو دیکھ لیا۔ وہ بیقرار ہو کر اسے سینے سے لگا لیتا اور اس طرح رام کے مضطرب دل کو قدرے سکون ملتا۔ اب تو موہن ہی اس کی زندگی کا سہارا رہ گیا تھا۔ لیکن رام بڑا بد قسمت تھا اس کی بدبختی اب بھی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ موہن کو دیکھ کر بڑے بڑے خیالی قلعے تعمیر کرتا۔ لیکن وہ سب تعمیر ہونے سے پہلے ہی مسمار ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کا نور، اس کے دل کا چین موہن بھی اسے داغ مفارقت دے گیا بھلا ایک ننھا سا بچہ سردی اور گرمی کی تکلیف کس طرح برداشت کر سکتا تھا جب بچہ چل بسا تو رام بچوں کی طرح بلند آواز میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اپنے

آپ سے کہنے لگا، آہ! میں نے لوگوں کا کہا کیوں نہ مانا۔ کیوں ان کے مشورے کے مطابق اپنے بچے کی حفاظت نہیں کی۔

اس کی چیخیں اور سسکیاں زمین ہلا رہی تھیں۔ بچّے کی لاش کو چتا میں رکھنے سے پہلے رام نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے ساون اور بھادوں کا سیلاب امڈ پڑا۔ پھر بھی طبیعت ہلکی نہ ہوئی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون پانی بن کر آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ رام کے لئے دنیا پھر پہلے کی طرح سنسان اور تاریک ہو گئی۔ رام کی دکھ بھری نگاہیں بچے کو بیکار تلاش کیا کرتیں۔ وہ اپنے بچّے کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنے کے لئے تصوّرات سے مدد لیتا لیکن اس کی تصورات کی دنیا میں اس قدر دھندلی چھا گئی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہتا۔

رام کے پاس موہن کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو دیکھ کر وہ اپنے دل کو تسلّی دیتا۔ اس کا بستر اور تمام چیزیں لاش کے ساتھ ہی چتا کی نذر کر دی گئی تھیں۔ بچّہ اپنی تمام نشانیاں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب اس کی یاد باقی رہ گئی تھی۔ جو خلش بن کر رام کو تڑپائے رکھتی اور اس کا بھولا بھالا معصوم تصوّر تھا۔ جو رمّیا کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ کو رات دن جکڑے رہتا۔

رام کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا کہ دوسرے کے باغ سے پھل چرا کر کھانے اور نقب لگانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور آج یہی خیال اس کے دماغ میں چکر لگا رہا ہے۔ رام گھاس کے تختے پر لیٹ گیا۔ اس کا سینہ پھٹنے لگا اور آنکھوں سے آنسوؤں ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ رموکے کے

بعد جب اسے کچھ سکون حاصل ہو گیا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ دوسرے لوگ جب چوری کرتے ہیں تو میں کیوں سوچ میں پڑ دوں۔ مجھے بھی تو موت کے آنے تک زندہ رہنا ہے۔ جس موت نے مجھ سے میری زندگی کو چھینا میری آنکھوں کا نور اور دل کا سکون چھینا۔ مجھے بے کس و بے مددگار بنا دیا۔

اس نے سامنے والی نالی کو عبور کیا اور دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شرم اور لحاظ اب اس کے دل سے رخصت ہو گئے۔ اس نے بڑی بے باکی سے دیوار پہ ہاتھ رکھا۔ اور فوراً دیوار پھاند کر سامنے کے کمرے میں لگے ہوئے قفل کو اس نے ایک ہی جھٹکے میں توڑ ڈالا۔ وہ مکان کے اندرونی حصے میں جا پہنچا۔ اسے اندھیرے میں کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ تھوڑی دیر بعد جب رام کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو گئیں اسے مکان کی ہر چیز نظر آنے لگی۔ تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ مکان نہایت صاف ستھرا تھا۔ اور خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس کی دیواروں پر خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ چاروں طرف قیمتی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ ایسی چیزیں اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ رام شش و پنج میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ چیزیں کس کام آتی ہیں وہ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا اس کی سمجھ نہیں آتا تھا کہ کون سی چیزیں چرائے۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا تھا۔ رام کو یوں معلوم ہوا جیسے ہر چیز پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ مجھے لے جاؤ"۔ لیکن وہ کسے لے جائے اور کسے نہیں۔ وہ سوچ کر دیوانہ ہو گیا۔ سامنے ایک صندوق پڑا تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا ڈھکنا توڑ ڈالا۔ اس میں سے چیزوں کا نکالنا شروع کیا۔ ایک کونے میں چند

چند سونے کے سکّے چمکتے نظر آئے۔ رام نے انھیں اٹھانے کے لیئے ہاتھ بڑھایا دفعتاً اس کی نگاہ ایک تصویر پر پڑی اور اس کی رگ رگ میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ فرطِ مسرّت سے وہ دیوانہ ہو گیا۔

وہ تصویر ایک ننھّے بچے کی تھی۔ تصویر کی مدد سے رام جس تصویر کو دیکھنے میں ناکام رہا تھا۔ آج اس تصویر کو کاغذ پر موجود دیکھ کر انتہائی خوشی سے پاگل سا ہو گیا۔ اسے یہ بات یاد نہ رہی کہ وہ یہاں کس لئے آیا ہے۔ اس نے تصویر کو اٹھا کر روشنی میں لایا۔ اور آنکھوں کو پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہی بھولی بھالی معصوم صورت۔ وہی بال، وہی آنکھیں، وہی دلکش مسکراہٹ ہو بہو اس کے بچّے موہن کی تصویر تھی۔

یہ تصویر کس بچے کی تھی؟ رام نہ جان سکا لیکن دل گواہی دے رہا تھا یہ موہن کی تصویر ہے۔ جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ چیز مل گئی۔ اس کا تمام رنج و غم اب کافور ہو گیا تھا کیونکہ اس کا کھویا ہوا موہن اب اس کے پاس تھا۔ اس نے تصویر کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔

اس نے اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ تصویر کو چھپا کر سینے سے لگائے وہ باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بجائے خوشی کی جھلکیاں نمایاں تھیں۔

ایک بار پھر رام کے بے قرار دل کو مسرّت حاصل ہو گئی۔ یہی چوری اسکی پہلی اور آخری چوری تھی۔ اولاد کی محبت میں اتنا دیوانہ ہوا کہ دولت کو ٹھکرا دیا۔ اس چوری کے بعد اس کے دل میں چوری کا خیال کبھی نہیں آیا۔ بچے کی

تصویر پاکر رام کو محسوس ہوا کہ اب اس کے پاس کسی شے کی کمی نہیں۔ یہی تصویر اس کا موہن تھی۔ اسی تصویر نے اسے اندھیرے سے نکال کر روشنی میں کھینچ لایا ہے ـــــ

*****

اوباش

شمی کی پُر از یاس و درد انگیز داستان کو طشت از بام کر دینے کے لئے نہ جانے کیوں مرا دلِ حزیں آج کئی دنوں سے مسلسل مجھے مجبور کر رہا تھا۔ اور ضمیر کی خواہش بھی ہے کہ اس عبرت ناک داستان کو صفحہ قرطاس پر لا کے ہی دم لوں۔ تاکہ انسان کو اپنے کھوئے درجے کو پانے میں کچھ مدد ملے اور حیوان نما انسانوں کو قصے کی تھاہ تک جانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اگر میں اس واقع کو وضاحت سے بیان کرنے سے رہ گیا، تو اس میں عصرِ حاضر کے بدلتے ہوئے انداز کو زیادہ دخل ہو گا۔

شمّی!! جو کہ اس بے وفا سنسار میں نہیں۔ البتہ اس کی یاد اب بھی بہت سے دلوں میں تازہ ہے۔ اور رہے گی۔ شمّی۔!! جو مکّر و دغا کی دنیا سے روٹھ کر بہت دور چلی گئی..... بہت دور...... جہاں سے واپس آنا بھی اس کے اپنے بس میں نہیں ہے اور نہ وہ آنا ہی چاہے گی۔ کیونکہ وہ اپنی مشیت مرضی سے اس دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئی۔

شمّی! جس کی یادگار اب صرف ایک مٹی کا ڈھیر ہے. جو گورستان میں پڑا ہے اور جس پر چمبیلی کا ایک پودہ بڑی آب و تاب کے ساتھ جھوم رہا ہے۔

شمی نے اپنی غیرت و حمیّت کو اپنے سے جدا نہیں کیا. بیز اس کی حفاظت کرتے کرتے اس نے اپنی زندگی کا گلا اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ حیوان نما انسانوں نے اس کی حسن، جوانی اور ننگ و ناموس کو لاکھڑا کر کے نیلام کر دینا چاہا تھا۔ اس کے سادہ پن و دلکش لچک کا سودا کرنا چاہا تھا لیکن شمی نے ان کے ناپاک و ذلیل ارادوں کو خاک میں ملا دیا. اس نے اپنی غیرت کو نہ جانے دیا. بلکہ ایک فاتح کی طرح زندگی کو نیچا دکھا کر آگے بڑھ گئی. اس نے ذلالت و خواری کے آگے سرنگوں ہونے سے موت سے بغل گیر ہونا افضل سمجھا۔

شمی! جس کی پاکباز و نیک نظری کے چرچے آئے دن اڑوس پڑوس اور قرب و جوار میں ہو رہے ہیں. لیکن آج وہ نیک نہاد دوشیزہ ہم سب کے لئے مر گئی ہے۔....... اس کی یاد ضرور اب بھی ہمارا تعقب کر رہی ہے. لیکن لحظہ بہ لحظہ وہ بھی دم توڑے گی اور پھر تو شمی مکمل طور سے فنا ہو جائے گی ـــ

بے شک شمی نے اپنی زلیست کی سلجھی راہوں کو خود ہی محدود کر دیا لیکن اسے مجبور کیا گیا کہ وہ فرار ہونے کی خاطر بغاوت کرے .... اپنی زندگی سے بغاوت اس کا عرصہ حیات انسان کے بھیس میں شیطانوں نے محدود کر دیا۔ جو ہوس پرستی سے رابطہ بڑھائے. مروّت سے کھیلنا اپنا فرض مقام جان گئے تھے۔

شمی بھی اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ نہ معلوم قدرت
کو کیا سوجھی کہ بچپن میں ہی والدین کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اور جمع شدہ پونجی انکی
بیمارداری کی نظر ہو گئی۔ شمی اپنے اکلوتے بھائی شہاب کے ساتھ زیست کی
الجھنوں اور وارداتوں سے الجھنے لگی ۔۔۔۔۔۔۔۔ وقت گزرتا چلا گیا۔۔۔۔
کئی بہاریں آئیں چلی بھی گئیں۔ کئی طوفان آئے اور اپنے اثرات بھی چھوڑ گئے۔۔۔
کئی بستیاں اجڑ گئیں۔ اور کئی بس گئیں۔

شمی اب چودہ برس کی بھرپور دوشیزہ تھی۔ عالم شباب عروج پر تھا۔
۔۔۔سبک اندام ۔۔۔۔ کشمیری شال جیسے نرم نرم گال ۔۔۔۔ ہرن کو مات
کر دینے والی چتون۔ حسین چہرہ، سیاہ زلفیں لمبی لمبی اور گھنی گھنی، ایسا لگتا
کہ جیسے کالے اور تاریک بادلوں نے رخ ماہ کو اپنے میں لپیٹ لیا ہو۔ بہرکیف
جو صلاحیتیں یا مراعات ایک دل کش و آدم زاد دوشیزہ میں ہونی چاہیے وہ سب
شمی میں موجود تھیں۔

نوشتہ تقدیر کے تحت شمی کے شباب و حسن، شوخ و چنچل ادا اور
بھولے پن کو ایک معمر سے منسلک کر دیا گیا۔ وہ بھی شمی کی ایک قریبی رشتہ دار
کے ہاتھوں جو کہ نہال تھا۔ خوش تھا۔ صرف ایک بات کی خاطر کہ شمی کا ہاتھ
ایک آفس سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھوں میں دیدیا ہے۔

شمی کا بھائی شہاب بھی مسرور تھا کہ اس کی بہن ایک اونچے گھرانے
میں چلی گئی ہے۔ جہاں اس کو جینے کے لوازمات حاصل ہو سکتے ہیں۔ شمی نے
رفتہ رفتہ اپنے ان جذبات اور امنگوں کو دبانے کی کوشش کی۔ اور اپنے

خاوند کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگی۔ شمی نے ماں کا درجہ پایا۔ اس کی گود میں ایک شکیل و جمیل لڑکی نے بسیرا کر لیا۔ کس قدر بشاش تھے وہ۔ ان کو تو جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا تھا...... اسی دوران روزگار کے سلسلے شمی کو اپنے شوہر کے ساتھ سری نگر سے جموں آنا پڑا۔ شعلۂ شکم بجھانے کے لئے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ فاعل حقیقی کا قانون بھی کچھ عجیب ہے۔ کبھی کسی کے لئے نشیب ..... کبھی فراز، کبھی بلندی، کبھی پستی۔

شمی جموں میں حسب معمول صوم و صلواۃ کی پابند رہی اور اس کے شوہر بھی احکام دین اپنانے میں پیش پیش رہتے تھے..... شمی خاوند کی اطاعت اور ان کی دیکھ ریکھ کے ساتھ ساتھ گھر کے سب کام کاج بنا کسی اعانت کے کیا کرتی تھی۔ بچے کھچے وقت میں سبق آموز ناولوں کا مطالعہ کرنا اپنا حسین مشغلہ بنا لیا تھا۔ وہ ناولوں میں اس قدر کھو جایا کرتی تھی کہ رات کا دن میں تبدیل ہونے کا بھی اسے علم نہ ہوتا تھا۔ اب اوقات شمی رات کو ہی جبکہ سارا عالم نشۂ نیند میں کروٹیں بدل رہا ہوتا تھا۔ لیمپ سلگائے کسی موضوع پر لکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔

شمی اب بھی حسین تھی...... دل کو لبھا دینے والی شکل۔ نزاکت افزا خدوخال اس کے باوجود بھی ہر جاہ اور ہر خواہش سے بے نیاز شمی بیک وقت بیوی اور ماں پارٹ خوش اسلوبی سے ادا کرنے میں مگن تھی... پھر کون سی ٹھوس وجہ تھی کہ اس ماحول میں قیام رکھنے پر بھی شمی نے اپنی زندگی سے دغا کی...... موت سے ہم آہنگی کرنے کی ٹھان لی۔ کون

سبھی رکاوٹیں رونما ہو کر اس کو جینے سے روکنے لگیں ..... اس ضمن میں جانکاری کا شوق ہر کسی کے دل میں کروٹیں لے رہا ہوگا ..... یہ سب کچھ اس خط سے معلوم پڑے گا۔ جو شمی نے راہ اجل اختیار کرنے سے چند ساعت قبل اپنی ایک جگری سہیلی شیاما کے نام پوسٹ کیا تھا۔ جو نامہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے شیاما کے بجائے اس کے بھائی بنسی کے ہاتھ لگا۔ جس نے حقیقت کو اجاگر کر دینے کی خاطر اس خط کی نمائش اپنے قریبی حلقے میں کر دینا ہی مناسب و جائز جان لیا۔ بنسی چونکہ میرے لنگوٹیے یاروں میں سے ایک ہے۔ اس لئے یہ عبرت نامہ میری نظروں سے بھی گزرا ..... خط کا نفیس مضمون کچھ اس انداز کا تھا۔

جان سے پیاری شیاما۔ جیتی رہو۔

زندگی کچھ بھی نہیں۔ مٹی، خاک، دھول۔ ایک سراب فریب اور دھوکا۔ یقین جانو زندگی بذات خود ایک بے وقعت اور مہمل سی حقیر شے ہے۔ جس کی اہمیت ایک ٹمٹماتے ہوئے دیئے سے کسی قدر زیادہ نہیں۔ جو ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے گل ہو سکتا ہے ..... زندگی! ایک لٹا ہوا بجرا ہے۔ جو بھنور کی زد میں آئے۔ ساگر میں تباہی و بربادی سے ہم آہنگ ہونے کی خاطر بے ارادہ، بے مطلب ٹھبک رہا ہے۔

..... میں نے ساری دنیا کو دغا بازی، جعل سازی اور مکاری کے پیرول میں ملبوس پایا۔ شیاما میں اس دنیا سے اب دور جانا

چاہتی ہوں ..... بہت دور جہاں سے میری صدائے بازگشت
بھی اپنے ہونے کا اعلان نہ کر سکے گی۔ میں نہ جانے کب سے
اس جہاں کو خیر باد کہنے کے ارادے باندھ رہی تھی۔ اور اب میں
اس بے مراد زیست سے الجھنا پاپ سمجھتی ہوں ..... گناہ
تصور کرتی ہوں اور زندہ رہنا بھی جرم خیال کرتی ہوں۔ میں
نہیں چاہتی کہ پھر سے زندہ رہنے کی چاہت مجھ میں اپنے
ہونے کا اعلان کر دے۔ یا جینے کی ہوس پھر سے میرے دل
میں جاگزین ہو جائے۔ اس لئے اس خط کے تحریر کرنے سے
پیشتر ہی میں نے وہ شئے پالی ہے۔ جو اس دغاباز سنسار سے
دور جانے میں میری مدد کر سکتی ہے۔

پیاری شیاما! یقیں ایسے بہت ہی کم ملیں گے۔ جو
بخوشی اس دنیا سے جانا چاہتے ہوں ..... بد قسمتی سے
میں بھی، بعض میں سے ایک ہوں۔ نہ جانے تم مجھے شوریدہ
حال یا پاگل تصور کرو ـــ لیکن میں کہوں گی کہ میں آج
بہت ہی نہال ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ انبساط کی چھپر کٹ
پر میرا قیام ہے۔ اور وہ کھاٹ ..... اوہ شیاما طوالت
میں پڑ کر خط کا اصلی مفہوم کھو دینا نہیں چاہتی۔ اس لئے
اتنا ہی جان لو کہ میں خوش ہوں شیاما! اس جہاں کو
چھوڑنے میں انسان کس قدر [illegible]

درجے سے گر کر جو کچھ کر دکھانا شروع کیا ہے۔ وہ اگر دیکھنا چاہتی ہو تو سماج کی چاردیواری کے اندر ہی چکر لگا لو۔ ہاں دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح انسان، انسان کی راہوں میں رخنے ڈال رہا ہے اور کس خوبصورتی اور قرینے سے انسان نے شرافت کا سینہ چھری سے کاٹ لینا اپنا ایمان جان لیا ہے۔ انسان واقعی بدل گیا ہے۔ ذلالت کی کھڈ میں گر پڑا ہے۔ میں اب تک قصے کہانیاں اس بارے میں پڑھتی یا سنتی تھی۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں دل ماننے سے رہ جاتا تھا۔ حالانکہ وہ بھی صداقت کی چھینٹوں سے ہی لبریز ہوا کرتی تھیں۔ اب تو دیکھ چکی دنیا میں رہ کر ناداری کا بدلہ۔ یہ سب کچھ مایا جال ہے ـــ اور کچھ بھی نہیں ـــ تم ہی بتاؤ اس دنیا میں کس پر اعتبار یا بھروسہ کیا جائے۔ جبکہ انسان بذات خود ایک راہزن سے کم نہیں۔ انسان بدل چکا ہے۔ انسان تو اب انسان کہلانے کا مستحق بھی نہیں ہے۔ اس نے بلند درجہ اور جلیل القدر وقار کو خود اپنے پاؤں کے تلے روند دیا۔ اور وہ سب اپنانے سے نہیں چوکتا۔ جو حیوان یعنی چوپائے بھی اپنے پر حرام تصور کرتے ہیں انہی انسانوں نے۔ ہاں ان نام کے انسانوں نے مجھے لوٹا۔ برباد کیا۔ اور تباہی کے کھڈ میں ڈھکیل دیا۔

یہی کوئی آٹھ بجے کا وقت تھا۔ وہ بھی تمام کا منی کے ابا چونکہ

منی کو سلا کر ایم۔ اسلم کے ناول "دُر توبہ" کے مطالعہ میں مشغول تھی۔

یہ وہی ناول تھا۔ جس کی تعریف تم نے میرے پاس بڑھ چڑھ کر کی تھی۔ دفعتاً دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یہ رحمان تھا۔ محمود صاحب کے ٹہلیا۔ اپنے صاحب کی خدمت کرتے ہوئے رحمان کو ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اور اگر بادل ناخواستہ محمود صاحب کسی اور جگہ کبھی تبدیل کئے جاتے تو پہلی فرصت میں ہی وہ رحمان کو اپنے پاس لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ رحمان بیگم صاحبہ کے ہمراہ میرے ہاں آیا جایا کرتا تھا اور بسا اوقات فرصت میں میری منی کا دل بھی بہلایا کرتا تھا۔

"کیا بات ہے رحمان؟" میں نے استعجاب سے دریافت کیا۔ "بیگم صاحبہ آپ کو یاد فرما رہی ہے۔ اس کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" رحمان نے جواب دیا۔

"لیکن بیگم صاحبہ تو آج سری نگر جانے والی تھیں اور"...

"اجی جی (رحمان بات کاٹتے ہوئے بولا) مطلع صاف نہ ہونے کے باعث جہاز نہ جا سکا۔ یہی کچھ تو صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔"

میں کسی حیلے بہانے سے کام بھی نہ لے سکی تھی۔ کیونکہ بیگم صاحبہ سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے آنے یا میرے

ان کے آ جانے سے دل بہل جایا کرتا تھا۔ حال ہی میں جبکہ موسمی بخار کا دور دورہ تھا۔ تو مجھے بھی اس نے اپنے شکنجے میں لے لیا۔ ان دنوں بیگم صاحبہ نے ایک دو راتیں میرے ساتھ جاگ کر کاٹی تھیں۔ مجھے رحمان کے ساتھ جانا پڑا۔ ویسے محمود صاحب کا گھر بھی ہمارے گھر سے دور نہ تھا۔ پھر بھی نشیب میں واقع ہونے پر ٹھنڈی سڑک کے گرد چکر لگا کے جانا پڑتا تھا۔

شیاما! کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے کو اکیلے پایا۔ صرف میں تھی۔ کمرے کا دروازہ کسی نے باہر سے ہی بند کر دیا کہ میں ہکا بکا رہ گئی۔ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی میں نے رحمان کو آوازیں دیں بیگم صاحبہ کی پوچھ گچھ کرنے کی خاطر دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن بے سود۔ مجھے جواب نہ ملا۔ بلکہ خاموشی۔ بلا کی خاموشی۔ میں اضطراب میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ یکا یک اندر کی طرف دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا ایک شخص۔۔۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس اور اس کے دست راست میں ایک بوتل تھی۔

"کون ہو تم"۔۔۔؟ میرے منہ سے بے ساختہ آواز نکلی۔

دوسری بتی آن کر دی گئی۔ اور میں نے دیکھا شیاما! محمود میرے سامنے کھڑے تھے۔

ہاں محمود صاحب ہاتھ میں بوتل لئے تھے۔۔۔ میری آنکھیں

پتھرا گیئں ۔۔۔ ! ہر سو اندھیرا چھانے لگا۔ مجھے کمرہ روشن ہونے کے باوجود بھی تاریک جان پڑا ...... تاریک اُس کی حالت دگرگوں تھی۔

میرے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے۔ میں نے ہزار ہا جتن کئے کہ اس کمرے سے باہر نکل جاؤں۔ اور اس کے جنگل سے آزاد ہو جاؤں۔ لیکن کوئی بھی دروازہ یا جھروکا اس قابل نہ تھا کہ کھل پاتا۔ مجھے ایسا لگا جیسے باہر سے ہی انھیں چٹخنی ماردی گئی ہو۔ میں نے اب بے بس ہو کر واویلا شروع کیا۔ محمود صاحب کے پاؤں پڑی کہ مجھے چھوڑ دو... رو ئی۔ دھوئی ...... اس پر بھی وہ مکار چراغ پا ہوئے خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورنے لگے۔ میں نے پھر لجاجت بھرے لہجے میں اس سے رحم کی بھیک مانگی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے ...... برابر میری جانب بڑھتے گئے۔ اور اندھیرے میں اس کمینے نے اپنی ہوس کا نشکار بنا لیا۔ میری بے بسی سے کھیلتا رہا ...... اور جب مجھے ہوش آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے گھر کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ باہر نکلنے پر رحمان نے پھر میرا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ میں اس زہریلے ناگ سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھی۔ بلکہ زبان ساکت گئے گھر ... گئی ... یاد

ہے کہ رحمان نے مجھ سے الگ ہونے پر کچھ اس طرح کہا تھا۔ "مجھے خدا کے لئے غلط نہ سمجھنا۔ مجھے چکمہ دیا گیا...... اور مغالطے میں رکھا گیا۔ میرا اگر قصور ہے تو اس قدر کہ آقا کا حکم بجا لایا نوکری چاکری ہوا کرتی ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے رحمان کا جملہ سنا اور جواب دیئے بغیر دروازہ بند کر دیا۔"

شیاما! اب بتاؤ کیا یہ دنیا انسانوں کی ہے؟ کیا اس میں انسان کا ٹھکانا ہے؟ اور کیا انسان قابل اعتبار ہے؟ کیا یہی مروت ہے؟ کہ محمود کی بیگم سے رابطہ بڑھایا تھا بہن سمجھ کر۔ اور جس کے کمینے دغاباز خاوند نے میری وقعت مٹی میں ملا دی۔ جب سے مجھے سنسار سے نفرت ہو گئی ہے...... پھر پور نفرت...... بے حد نفرت اور اب جینا گناہ سمجھتی ہوں یا پاپ تصور کرتی ہوں...... میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتی۔ جانے کا وقت آپہنچا ہے...... وقت [illegible] تمنا ہے کہ میں تمھیں سب کچھ بتا سکوں...... سب کچھ......

شیاما! پھر بھی اس نیچ نے میرا پیچھا نہ چھوڑا بلکہ دوسرے روز وقتِ شام رحمان پھر میرے ہاں آیا... میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ "صاحب نے پھر بلایا ہے اور یہ خط بھی دینے کو کہا ہے [illegible]

دے مارا۔ اور خوفزدہ نگاہوں سے لفافہ کو دیکھنے لگی......

چاک کر دیا...... تو شیاما ایک نامہ تھا..... اور یہ..... اور

ایک تصویر تھی۔ ہاں ہاں تصویر........ میری برہنہ تصویر۔ میرا

عریاں فوٹو کھینچا گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا۔ جیسے کیڑوں نے مجھے جگہ

جگہ سے کاٹ کھایا ہو۔ میرے رونگٹے رونگٹے میں کسک و درد

سما گیا۔ میرا سر چکرا گیا...... اور پھر سے مجھے ساری دنیا تاریک

دکھائی دینے لگی...... میری آنکھیں نیل گوں ہونے لگیں۔

مجھے پھر سے اپنی تباہی کے احساس نے ڈسنا شروع کر دیا۔

وہ بھی بری طرح...... اضطراب میں پڑے میں نے نامہ کو

پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔۔۔

"پیاری اب میں لکھوں کیا۔ جبکہ ہمارے مابین حائل

شدہ دیوار ہمیشہ کے لئے مسمار ہو گئی ہے۔ اور حجاب کے پردے

بھی ختم ہو چکے ہیں۔ گویا ناز و نیاز کے پردوں کا سوال ہی نہیں

میں اس نامہ کے توسط سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم روزانہ

شام کو میرے ہاں نہ آؤ گی تو یاد رکھنا ارسال کردہ تصویر کی

نمائش اچھے طریقے سے کرنا میں جانتا ہوں۔ اگر تمھیں اب بھی

اپنی ننگ سے لگاؤ...... خاندانی ناک کا پاس ہے تو امید

ہے کہ تم میرے لکھے گئے سے اتفاق کرو گی۔ یقین جانو میں تمھارا

حریف نہیں ہوں بلکہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمھاری

زیست کی راہوں کو استوار کر دینے کے لئے ہی یہ سب کچھ کر گیا ہوں۔ کہیں مجھے غلط نہ سمجھ لینا۔"

شیاما! دیکھا بے بسی کا منظر۔۔۔۔۔ اب میں کیا کرتی۔۔ ۔۔۔۔ کیا نہ کرتی۔ حالت مرغ نیم بسمل سے کسی قدر کم نہ تھی۔۔۔۔ کیا بتاؤں یہ خط پڑھ کے مجھے کتنا دکھ ہوا۔ اور کس قدر کوفت ہوئی۔ دل ناتوان پر اس وقت کیا گزری۔ میں بیان ہی نہیں کر سکتی۔ وہ حالت جو اس وقت میری تھی۔۔۔۔۔۔۔ دل نے چاہا کہ اس نامے کی نمائش خود ہی کر دوں۔۔۔۔۔ اور محمود کی شرافت کا خول اتار دوں۔ لیکن ضمیر نے ایسا کرنے سے روکا۔ مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ اور نہ ہی میں ایسا کر سکی۔۔۔۔ مجھے اپنی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن منی کا خیال آیا ــــ اس کے مستقبل پر تاریکی چھا جاتی ہے وہ تباہ ہو جاتی۔ انھیں خیالات میں غرق۔ میں نے پھر سے اپنی آنکھیں تر پائیں۔ ہو بہاں آنکھیں، اور میں بچوں کی طرح ڈھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اس قدر روئی کہ رو رو کر نڈھال ہو گئی۔ مجھے اتنا بھی علم نہیں کہ کس نے مجھے کھاٹ پر سلا دیا۔ ہوش آنے پر دیکھا۔ کہ رحمان میرا سر دبا رہا ہے۔ رحمان بھی رو رہا ہے۔ اور بولا رُو رُو کر جی ہلکان نہ کرو۔ مجھے تمہاری بے بسی کا احساس ہے۔ یقین رکھو کہ اب میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ میں اعا

کے لئے حاضر ہوں۔ میں نے کل جو کچھ بھی کیا مجھے اس کے لئے معاف کر دو۔ لیکن میں وثوق سے کہوں گا کہ مجھے دھوکہ دیا گیا مجھے مغالطے میں رکھا گیا۔"

"جاؤ رحمان جاؤ!! میں اس ذلیل کا منھ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ جس کی اپنی بیٹی عالم شباب میں قدم رکھ چکی ہو۔ اور دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزت کا اس کو پاس نہ ہو۔ حیف اس پر اور اس کے بدکرتوتوں پر' لعنت ہے اس کمینے پر۔" اس پر رحمان بھر گیا ہوا......" پر وہ تو نہ جانے کیا کچھ کرے گا۔ فوٹو کی دو کاپیاں ہیں۔ رف پر وف اب بھی اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ نہ جانے ان کاپیوں کا کتنے طریقوں سے استعمال میں لائے گا۔ وہ اپنی ضد کا بڑا پکا ہے ان کاپیوں کا حاصل کرنا بہت ہی ضروری ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا...... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم چلے جاؤ رحمان! چلے جاؤ۔" میں برس پڑی۔

رحمان چلا گیا۔ اور میں سوچنے لگی کہ اب میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ جس کے بل پر سماج اور سوسائٹی میں سر اونچا کرکے جی سکوں! ــــ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی۔ اپنے وجود سے دشمنی! ــــ اور اپنی بے بسی پر ماتم کرتے ہوئے محمود صاحب کے بنگلے کی جسست چل پڑی۔ اس خیال کو دل

میں لبسائے کہ شاید وہ میری بدحالی دیکھے اور تصویریں واپس کر دے.
..... میری برہنہ تصویریں ___ میں نے اس حیوان نما انسان سے
التجا کی. اس کے سامنے گڑگڑائی اور اپنی ایک اکیلی منی کے
مستقبل کا واسطہ دے کر رحم کی بھیک مانگی. لیکن اس نے ایک،
نہ مانی اور نگیٹو واپس کرنے سے انکار کیا.

آج صبح رحمان نے موقع پا کر ہی وہ تصویریں مع رف
یہ رف کے مجھے لا کر دیں. اس بیچارے نے میری خاطر چوری
کی. میں نے ان کاپیوں کو نذر آتش کیا. اور آہ سرد کھینچ کے
رحمان کو گلے سے لگائے رخصت کیا. وہ بچوں کی طرح بلک
بلک کر میری حالت پر رو رہا تھا.

شیاما! یہ ہے میری داستان! اب میں چلی جاتی ہوں.
یقین کرلو. اب اس دنیا سے مجھے نفرت ہو چلی ہے. اس جہاں کی
ہر چیز مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے. میں نے اپنی زیست کا گلا خود
اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ دیا ہے... . . . اور میں جا رہی ہوں.
. . . . بہت دور . . . . . جہاں سے میرا واپس آنا ممکن نہیں! ___
اوہ! یہ اندھیرا . . . . . . یہ تاریکی . . . . . کوئی مجھے لینے کے لئے
آ رہا ہے . . . . مجھے اجازت دو بہن!! اس خط کو پڑھ کے ضائع
کر دینا . . . . اور ہو سکے تو منی کی دیکھ بھال کرنا . . . خدا حافظ . .

تمہاری بدبخت سہیلی شمی

شمی چل بسی ...... اور یہ بھی زیب داستان کے لئے رقمطراز کرتا چاہوں گا کہ شمی کی رحلت کے بعد ہی منیؔ کی صحت گر تی گئی اور کچھ دنوں کے بعد وہ بھی اس دنیا چھوڑ گئی۔ ابدی نیند سو گئی۔ اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ خود شمی کو منی کا اس دنیا میں رہنا بار خاطر گزرا ہو ...... اپنی داستان غم یاد آئی ہو۔ اور منی کو دغا بازی و مکاری سے لبریز دنیا میں رکھنا مناسب نہ جان لیا ہو۔

آج شمی دنیا میں نہیں لیکن اس کی کہانی امر ہے۔

یادرفتہ

آزادی۔۔۔۔ کتنا دلکش اور پیارا لفظ تھا۔ کس قدر مٹھاس تھی۔ اس میں ہزاروں آشائیں اسی شانتی پر سے نثار ہو کر خوشی کا پیغام پہنچانے لگیں۔ چاروں طرف خوشی کے ڈھول پیٹے گئے ـــــ مسرت کے نقارے بجائے گئے سیٹھ دانوں کی باچھیں کھل گئیں۔ شیر دکسان بھی دھرتی کی آزادی پر پھولا نہ سمارہا تھا۔ آسمان پر اس وقت اکا دکا بادل تیر رہے تھے۔ آزادی کی خوشی میں آہستہ آہستہ آکاش کا رنگ سرخ ہوتا گیا اور افق پر شوخ رنگ کے بادلوں کا ایک ہجوم جمع ہوا۔۔۔۔۔ آزادی کی تقریب پر ـــــ

شیر د کی پتنی ریتا بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اب اپنا راج ہو گا۔ اپنی سرکار ہوگی۔ ہمیں اپنی محنت کا پورا پورا پھل ملے گا۔ ہماری کھیتیاں ہمارے لئے دوبارہ ہری ہوں گی۔ سیٹھ ساہوکار ہم پر اپنا رعب جمانا چھوڑ دیں گے۔ اب ہمیں زمیندار کے ظلم نہیں سہنا ہوں گے۔ ہماری بہو بیٹیوں کو سکھ کی نیند آئے گی۔ اور وہ اپنے جیون ساتھیوں سے آنند سے رہیں گی۔ ان کی زندگی مسکرا اٹھے گی۔ اب ہوس پرست زمینداروں کا ہم پر رعب نہ چلے گا۔ اب ساہوکاروں

کی ناپاک ہوس دم توڑ کر رہ جائے گی۔ سرمایہ دار، زمیندار اور امراء اب ہم جیسے ننگے بھوکے انسانوں سے رحم کی بھیک مانگیں گے" ——— ریتا پھر سوچنے لگی "اب اس کی سولہ سالہ نوجوان لڑکی مدھو دیہاتی بھولی بھالی دوشیزہ زمینداروں اور ساہوکاروں کے نوجوانوں کا کھلونا نہیں بنے گی"

ریتا، شیرو اور ان کی اکلوتی بچی مدھو ادھر اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ادھر سیٹھ دانو اور ان کے ہمنوا اپنی لوٹ کھسوٹ اور نت نئے داؤں کی سوچ وچار کر رہے تھے۔ آزادی مل گئی۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے اب آزاد ملک کے ساہوکاروں کو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہوگا۔ آزاد حکومت کے کرتا دھرتا ان کے اشاروں پر ناچیں گے۔ وہ جس قدر چاہیں گے ذخیرہ اندوزی کر کے بلیک مارکیٹ میں بیوپار کریں گے۔ غریب کاشتکار کسان اور پست طبقہ لوگوں کا آخری قطرہ خون تک نچوڑیں گے۔ یہاں تک کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑیں گے۔ کسانوں اور مزدوروں کی سال بھر کی کمائی کو ایک دن میں غصب کریں گے . . . . .

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ جس کا مدھو سے لے کر سیٹھ دانو تک کو انتظار تھا۔ لیکن آزادی کے ملتے ہی نہ جانے کیوں۔ مدھو کا کھلا ہوا چہرہ شگفتہ ہونے کے بدلے اداس ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ آزادی سے بھرپور وقت، وہ وقت جس میں غریبوں کی خوشیاں مضمر تھیں . . . . مگر مدھو اور اس کی طرح کی ہزاروں غریب مزدوروں اور کسانوں کی زندگیاں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بے ارادہ ادھر سے ادھر اڑنے لگیں۔ ان کی تمنائیں جو رکی تو ں

کے رکھوالے راضی ہوئے ہیں۔۔۔۔ بیٹی یہی آزادی کا چراغ جلانے کے لئے ہم نے خود کو جلا کر راکھ کر لیا۔۔۔ اور میں خوش ہوں۔ کہ وطن میرے لختِ جگر کے خون سے روشن ہے"۔ ــــ اور مدھو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ تو ریتا بولی۔۔۔ "او دیوانی۔ تو کیوں رو رہی ہو۔ کیا کوئی تیرا مکان تھوڑا ہی جلائے گا۔۔۔۔ پگلی آنسو پونچھ ڈال"!

"کیا یہ آزادی ختم نہیں ہوسکتی ماں"؟ مدھو سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"کیا بکتی ہو تم۔ پاگل ہوتی جا رہی ہو، کوئی دوست دشمن سن لے گا۔ تو تیری زبان کھینچ لی جائے گی"۔ ریتا نے جواب میں کہا۔

مدھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ریتا اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کو تسلی دینے لگی۔۔۔۔۔ "میری مدھو رانی تم دل چھوٹا نہ کرو۔ بیٹی ہم تو اس دھرتی کے پاپ ہیں۔ ہم سب کچھ دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ لیکن کچھ بول نہیں سکتے زمانے کے انقلاب کے تحت ہمیں سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ یہ انقلاب ہر چیز کو بدل دیتا ہے۔۔۔" اور مدھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چلا اٹھی۔۔۔۔ "ماں۔۔۔۔۔ غضب ہوگیا۔۔۔ وہ دیکھو میری پیاری سہیلی شوری کا گھر۔۔۔۔ بھگوان! اگر آزادی کے بدلے تم اس قسم کی بھینٹ مانگ رہے ہو۔ تو واپس لے لو اپنی آزادی۔۔۔ ہمیں تمہاری آزادی نہیں چاہیئے۔ جس کے ملتے ہی بے بس انسانوں کی عزت انسانیت کے خونخوار بھیڑیوں نے اپنے پنجوں سے زمین کھود کر دفن کرنا شروع کر دی ہے۔۔۔۔ آزادی کا چراغ جلانے کے لیے جنہوں نے خود کو جلا کر فنا کر دیا آزادی کی سلامتی کے لیے

رہیں۔ ان کے ارمان پورے نہ ہوں ——— دوسری طرف دانوں سیٹھ کی توند بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ اور اس کے ہمنوا آزادی کو کام میں لانے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک دن ساون کی کالی کالی گھنگھور گھٹاؤں نے جھوم جھوم کر کاشتکاروں، کسانوں اور مزدوروں کو خوشی کا پیغام سنایا۔ ویران باغوں میں کوئل پھر سے کوکنے لگی۔ اور آکاش کی مانگ میں بجلی سیندور بھرنے لگی ـــ کہیں کہیں ہلکی ہلکی پھوار کی چھینٹیں بھی پڑنے لگی تھیں۔ اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے۔ کہ ان کی کھیتیاں پھر سے ہری بھری ہو جائیں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان غریبوں کو کیا معلوم تھا۔ کہ ان کی آشا کبھی پوری نہ ہو گی۔ بلکہ قدرت ایسی لیلا رچا کر ان سے مذاق کر رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ان کی امنگوں کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھر بھی سوچ رہے تھے، کہ اپنی ناکامیوں کے سہارے وہ کامیابی کا دامن تھام لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا کامیابی کی جگہ بربادی نے لے لی۔ سرخ مائل چہرے زرد پڑنے لگے۔

مدھو چیخنے لگی۔ ماں ارے او ماں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کہاں ہے۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ ماں۔ ۔ ۔ ۔ آگ کے شعلے۔ ۔ ۔ ۔ یہ گھر کیوں جل رہے ہیں ماں ـــ اور ریتا آزادی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "بیٹی یہ جشن چراغاں ہے۔ ۔ ۔ ۔ آزادی کے چراغ جل رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ بیٹی ہم آزاد ہیں۔ مالک نے ہمیں بڑی بڑی قربانیوں کے بعد یہ آزادی دی ہے۔ یہ آگ!! یہ شعلے!!! بڑی منتوں کے بدلے مرادوں کے یہ دن دیکھنا نصیب ہوئے ہیں۔ دنیا

جنھوں نے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ مالک انہی کو آج لوٹا جا رہا ہے۔ انہی لوگوں کی زندگی جہنم بنائی جا رہی ہے۔

.......اوہ! آج معلوم ہوا۔ تم کتنے کٹھور ہو۔ تم امیروں، ساہوکاروں کے بھگوان ہو۔ تمھیں بےبس اور لاچار لوگوں سے کیا غرض۔ میری یتیم کمسن سہیلی کا سکھ تمھیں ایک آنکھ نہ بھایا اس کا چھوٹا بھائی اور بوڑھی ماں کہاں کہاں دربدر کی خاک چھانتے پھریں گے...... کیا یہی تیرا انصاف ہے؟...... نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں انھیں دربدر کی ٹھوکریں نہیں کھانے دوں گی۔ ماں میں جا کر انھیں اپنے پاس لے آؤں گی۔"........"نہیں مدھو تم وہاں نہیں جا سکتیں۔" رتیا نے جواب میں کہا۔ اور مدھو زوردار آواز میں بولی "ماں میں ضرور جاؤں گی۔ اور ابھی جاؤں گی۔ میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔" مدھو بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی اور ماں اسے روک رہی تھی۔ اس پر مدھو بولی۔

"جانے دے ماں کہیں میری سہیلی مجھ سے ہمیشہ کے لئے نہ چھوٹ جائے۔" "نہیں میں تمھیں کبھی نہ جانے دوں گی مدھو........ رتیا بولی۔" وہ غنڈے اور درندے نما انسان تمھیں بھی مار ڈالیں گے۔"

"ماں اگر میری جان شوری کی آن پر قربان ہو جائے تو میں جان لوں گی کہ میرا جیون سپھل ہو گیا۔ ماں دنیا مجھ پر تھوکے گی۔ کہ سہیلی کے کام نہ آ سکی۔" یہ مدھو تھی۔

اتنے میں شیر دآہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ وہ مزدوری کرنے گیا تھا۔ اس کا جسم لگاتار محنت سے سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ سر کے

بال بالکل روئی کے مانند سفید ہو چکے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ مزدوری کئے جا رہا تھا۔ امید دل و آرزوؤں کے سہارے پسینہ بہاتا تھا۔ وہ بھی دکھی معلوم ہو رہا تھا۔ کندھے پر چڑھے ہوئے کمبل کو زمین پر بچھا کر بیٹھ گیا۔ ایک نظر اس نے رتیا پر ڈال دی۔ رتیا کو دیکھ کر اس کے دل میں تمنا ابھری ...... آرزو جاگ اٹھی ..... آنکھوں کے آنسو دل کی آگ بجھانے میں کوشاں تھے۔ رتیا کی آنکھوں میں شیرو نے غربت اور حسرت کی ایک تصویر دیکھی۔ جس کے سیاہ نقش و نگار مصور نے ادھورے چھوڑ دئیے تھے۔ ناتمام نقوش ...... اور مدھم لکیریں ...

... سب سیاہ۔ مگر رتیا کے چہرے پر سیاہی نہ تھی۔ اور پھر ایک گھناؤنی مسکراہٹ کے ساتھ شیرو کچھ سوچنے لگا۔

"تم مسکرا رہے ہو بابو۔ گاؤں کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔ گاؤں کے غریب پڑوسیوں کی جھونپڑیاں جل رہی ہیں۔ اور تم ..... بابو تم اتنے کٹھور تو کبھی نہ تھے۔ کہاں گیا تمہارا آزادی سے بھرپور جنون؟"

"..... کٹھور ... تو یہ سمجھتی ہے مدھو کہ میرے دل میں درد ہی نہ رہا۔ نہیں ایسا نہیں بٹیا۔ میں بھی انسان ہوں۔ میں بھی پیار و محبت بھرا دل رکھتا ہوں۔ اگر اس وقت خونخوار درندوں کے کرتوت دیکھ کر میرے سینے میں بھی ایک بھٹی جل رہی ہے۔ تن بدن پھنکا جا رہا ہے سب کچھ دیکھ رہا ہوں لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔" شیرو نے مدھو سے کہا۔ اور خود پگڑی سے بندھے ہوئے تماکو کو سے کھول کر بیڑی بنانے لگا۔

مدھوا اپنے باپ سے التجا کرنے لگی۔ "باپو مجھے جانے دو۔ جانے دو باپو
میں شوری کو بچاؤں گی"۔

"شوری کو...... نکلی کہیں کی...... میں خود آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں
بوڑھی آگ کے شعلوں کی نذر کر دی گئی ہے۔ ننھا منا بھی دنیا کو خیرباد کہہ
گیا۔ انسانیت چیخ چیخ کر اپنی بے کسی کا ماتم کر رہی تھی ..... تمہاری
شوری ...... اسے نوجوان سرمایہ دار...... مالک کا عطیہ
سمجھ کر لے اڑے"۔ شیرو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

مدھو باپ کی باتیں سن کر بیہوش ہو گئی۔ شام ہو رہی تھی۔ سورج
مغربی افق پر الوداعی جھلک دکھا رہا تھا۔ کھیتیاں اداس اداس نظر آ رہی
تھیں۔ جنگل کے چرند پرند خاموش گردن جھکائے واپس لوٹ رہے تھے۔
گھر جل جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ ان میں چنگاریاں بے بس انسانوں کی چنگاریاں
دوسری طرف انسانیت کے دشمن ساہوکار لوٹا ہوا مال غنیمت آپس میں
بانٹ رہے تھے۔ غریبوں کا خون بہا کر حاصل کیا گیا مال..... مگر اتنا
کچھ ہونے پر بھی دنیا کے رکھوالے حسب عادت خاموش تھے۔ بے زبان جو
ٹھہرے! کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن طاقت گویائی سے عاری۔ اشارہ سے
بتانا چاہتے تھے۔ لیکن سکت نہ تھی کہ ہاتھ ہلا سکے۔ بھگوان جو ٹھہرے غمناک
فضا میں اداسیاں نوحہ کر کے تھک چکی تھیں۔ چاند آسمان پر ایک دفعہ
چمکا تو ضرور۔ لیکن جونہی اس کی نظر بستی پر پڑی۔ بستی کے جلے ہوئے ملبوں اور
راکھ کے ڈھیروں پر پڑی تو اداس ہو کر بادل کی چادر میں منہ لپیٹ کر غائب

ہو گیا۔ ہر طرف ہراس اور قبرستان کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی کے پاؤں کی چاپ نے مدھو کو ہوشیار کر دیا۔ "میری شوری بہن آ گئی؟" لیکن وہاں شوری کے بجائے اس کا باپ کھڑا تھا۔

تو عمر مدھو۔ نامعلوم اس کا دل کتنی ناکام آرزوؤں کا مدفن تھا۔ کتنی تمناؤں کا گلا اس نے اپنے ہاتھوں گھونٹ دیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی نہ مری۔۔۔ سسکتی رہتیں۔ وہ شوری کے غم میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ وہ ہر دم گاؤں کے بڑے بڑے زمینداروں، ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے خلاف نعرے بلند کیا کرتی تھی ــــ گاؤں والے آزادی کنے دیوتا کی توہین برداشت نہ کر سکے۔ ایک دن انھوں نے ٹھان لی کہ جیسے بھی ممکن ہو شیر دل مدھو کو اپنے ہوس کا شکار بنایا جائے اور اسے بھی شوری کے پاس پہنچا دیا جائے۔ سیٹھ دانو چاہتا تھا کہ وہ ایک ہی رات کے لئے ہی ہی لیکن مدھو کی آغوش محبت اسے میسّر ہو۔ ہری پرشاد کی نظر بھی غریب کی اس پونجی پر گڑی تھی۔ مدھو کا سانولا رنگ، نمکین چہرہ۔ کالی کالی چمکدار آنکھیں۔ دیکھ کر نواب احبا بھی ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنے ابھرے ہوئے گداز سینوں سے وہ اپنے بے چین سینوں کو تسکین دے چکے تھے۔ سینکڑوں حسین پھول انھوں نے اسی طرح مسل دیئے تھے۔ سینکڑوں ابھرتے ہوئے سخت سینوں کو انھوں نے اپنے بازوؤں میں لے کر خوب بھینچا تھا۔ اور بے شمار گلابی ہونٹوں کا رس وہ چوس چکے تھے۔

ادھر مدھو کا باپ بیمار تھا۔ لگاتار کھانسنے سے اس کا کمزور سینہ

چھلنی ہو گیا تھا۔ جمع شدہ پونجی ڈاکٹر کی فیس اور دوائی پر صرف ہو گئی۔ اور آج شیردسے کے گھر میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر مرض کی شدت اسے روکے رہتی۔ مجبوراً مدھو کو اناج لے کر شہر جانا پڑا۔ تاکہ اسے فروخت کر کے باپو کے لئے دوائی لے سکے۔ شہر میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر اس خاندان پر پڑی۔ جو چار اونچے اونچے کھمبوں پر کھڑی ہوئی لکڑی کی دوکان کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

وہ شہر کی طرف چل پڑی کلب کے ایک احاطے میں داخل ہو کر اسے مایوسی ہو گئی۔ کلب کا سائبان اندر سے خالی پڑا تھا۔ صرف چند ہندوستانی صاحب اور میمیں کولھے سے کولھا ملا کر ناچنے کی پریکٹس کر رہے تھے اور رقص کرتے کرتے کلب ہال میں آسودہ اور خوش حال قہقہے بلند ہو جاتے تھے۔ اس نظارے سے مدھو کو بڑی تکلیف ہوئی۔

مدھو کی طبیعت کراہ اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس ہال کے ان سارے جگمگاتے قمقموں کو ایک ایک کر کے زمین پر پٹخ دے۔ اور رقص کا گلا گھونٹ دے ــــ ساتھ ہی بیمار باپ کے خیال نے اسے چونکا دیا۔ اناج فروخت کر کے وہ باپو کے لئے دوائی کی شیشی لے کر گھر کی طرف آ رہی تھی۔ گاؤں میں قدم رکھتے ہی سیٹھ کے کارندے اسے لے اڑے۔

وہ مالک کو پکارنے لگی۔ اور بھگوان اسے پکارنے لگا۔ کسی نے شیردسے کہا کہ اس کی بیٹی مدھو سیٹھ دانو کے بنگلے میں قید ہے اور اس کی عصمت خطرہ میں ہے۔ [illegible]

طرف چل پڑا لیکن اس کے پہونچتے پہونچتے مدھو لٹ چکی تھی۔ اور سیٹھ کے ملازموں کے ہاتھوں پٹ کر بری طرح مجروح ہو گیا تھا۔ اسے سیٹھ کے نوکر جھونپڑی میں ڈال آئے۔ آزادی کے دیوتاؤں کے چرنوں میں مدھو اپنی جوانی، اور دوشیزگی کی بھینٹ چڑھا کر گھر واپس لوٹ رہی تھی۔ مدھو نے کٹیا میں قدم رکھا ہی تھا کہ دیا بجھ گیا۔ رتیا کی دنیا اجڑ گئی۔ سرمایہ دار مسکرا رہے تھے۔ آزادی قہقہہ لگا رہی تھی ....

دن بیتتے چلے گئے۔ کھیتیاں سوکھتی اور جلتی چلی گئیں — پرارتھنائیں، دعائیں سب بے اثر ثابت ہوئیں۔ خون پسینہ ایک کر کے کسانوں اور کاشتکاروں نے جو غلہ پیدا کیا تھا وہ کچھ تو زمینداروں کے ہاتھوں میں آیا۔ اور باقی سرکاری ذخیرہ میں داخل کر دیا گیا۔ کسان دانہ دانہ کو محتاج تھے۔ بچے بلک بلک کر جان دے رہے تھے۔ لیکن دیش کا سرمایہ دار طبقہ اس وقت بھی عیش و طرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ غلہ بلیک مارکیٹ میں اور بے بس دوشیزاؤں کی عصمت بازاروں میں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بازار گرم تھا۔ البتہ غریبوں کے ارمان ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

بھوک سے نڈھال ہو کر مدھو زمین پر گر پڑی۔ رتیا دوڑ کر قریب آئی تو مدھو بولی "دیکھتی ہو ماں۔ آزادی کے کرشمے ...... ہاہا..... آزادی... ...جس کو حاصل کرنے میں ہم نے سب کچھ لٹا دیا..... اپنی عزت تک ...ماں آزادی ہمیں کہاں ملی ہے.... آزادی تو امیروں، ساہوکاروں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو ملی ہے اور ہمیں وہی بھوک بیماری، لو یہ

کی زنجیریں اور جیل کی چار دیواری ۔۔۔

ماں بولی :۔ "درگا بیٹی یاد رکھو بھگوان سب کچھ دیکھتا ہے یہ مال و دولت یہ جاہ و حشم جس پر ان درندوں کو فخر ہے ۔ غرور ہے کچھ دنوں کے لئے ہیں ۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے بیٹی ! دنیا بے ثبات اور دولت ناپائیدار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دل میلا نہ کرو ۔ یہ بھی مالک کا امتحان ہے "

سات دن کا فاقہ اور بھگوان کا امتحان ۔ ۔ ۔ ۔ ماں کون سا بھگوان ؛ اور کس کا بھگوان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہمارا نہیں ۔ ہماری فریاد کے لئے اس کے کان بند ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماں وہ ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا بھگوان ہے وہ سیٹھ دانو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو غریب ٹھہرے ۔۔۔ مالک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مبارک ۔ ۔ ۔ ۔ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آزادی ۔ ۔ ۔ ۔ جس نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے بسوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جینا دوبھر ۔ ۔ ۔ ۔ کردیا ۔ ۔ ۔ ۔ ماں ۔ ۔ ۔ ۔ تمھیں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مبارک ۔ ۔ ۔ ۔ ہو ۔ آزادی ۔ ۔ ۔ " اتنا کہہ کر بدھو ماں کے قدموں پر گر پڑی ۔ چند لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں ۔

تیا نے اکلوتی بیٹی کی ناگہانی موت پر سرد آہ کھینچی ۔ اولاد کی پیار کی بھوکی ۔ تیا نے بدھو کی لاش کو سینے سے لگایا اور وہیں بیہوش ہو کر گر پڑی ۔ تھوڑی دیر میں یہ کہہ کر اٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ "پانی ڈالو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آگ ۔ ۔ ۔ ۔ آگ میں جل رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آزادی کی آگ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اور اتنا کہہ کر ایسی گری کہ پھر نہ اٹھ سکی ۔ ہمیشہ کے لئے وہ بھی اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ۔

ایک طرف ماں کی اور بیٹی کی لاشیں پڑی تھیں۔ جھونپڑا ماتم کدہ بنا تھا۔ اور دوسری طرف آزادی کے دیوتا اب بھی خوشی کے ڈھول پیٹتے ہوئے جا رہے تھے۔

کفرانِ نعمت

فیض کچھ دیر پہلے باہر چلے گئے تھے۔ سندری اندر پلنگ پر پڑی خراٹے بھر رہی تھی۔ اور باہر دالان میں بیٹھی راحت سوچ رہی تھی کہ —— "جب کوئی چیز خراب یا ناکارہ ہو جاتی ہے۔ تو ہم اس کو نئی چیز سے بدل لیتے ہیں۔ زیور۔ رات لباس۔ فرنیچر۔ ریڈیو۔ گھڑی...... اور دیگر کئی چیزیں پرانی ہو جاتی ہیں۔ تو ہم انہیں پھینک دیتے ہیں یا ایک کونے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور بازار سے ان چیزوں کی جگہ نئی خرید لاتے ہیں۔ کیا بیوی بھی انہی ناکارہ اور خراب شدہ چیزوں کی طرح خراب ہو جاتی ہے۔ اور پھینک دی جاتی ہے؟

کیا بیوی پرانی ہو جائے تو اسے کونے میں ڈال کر نئی عورت خرید لی جائے؟۔ کیا عورت ایک ایسی چیز ہے۔ جو خریدی جا سکتی ہے۔ اور بیچی جا سکتی ہے۔؟ کیا بیوی نئی اور پرانی ہو سکتی ہے؟...... نہیں یہ ایسا نہیں ہو سکتا...... یہ سب لغو ہے...... بیوی ایک ایسی جنس ہے جو کبھی اور کسی صورت میں بھی بدلی نہیں جا سکتی...... لیکن پھر سندری

میری جیسی بسائی دنیا میں کیسے ...

سندری کو والدین نے بیاہا نہیں ہے۔ بلکہ چالیس سالہ فیض کے ہاتھوں بیچا ہے اس کی ابھرتی ہوئی جوانی کا نیلام کر دیا ہے۔ اور فیض نے چند سونے کے جگمگاتے سکوں کے عوض سندری کو نہیں بلکہ اس کی خوبصورتی کو خریدا ہے۔"

آنا کچھ سوچنے کے بعد راحت فیض کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔

"چاہتی ہو تو میکے چلی جاؤ۔ تمہیں ہر قسم کا آرام مل جائے گا۔"

لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ کہ اس نے صرف اتنا کہا کہ گھر کے کاموں میں بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ وقت پر کسی کو کھانا نہیں ملتا۔ اس نے کوئی بری بات تو نہیں کہی تھی صرف فیض کے بھلے کے لیئے کہا تھا۔ کیونکہ وقت پر کھانا نہ ملنے پر اسے دفتر بھوکا جانا پڑتا تھا۔۔۔۔ جب وہ تنہا اس کی مالکہ تھی۔ فیض خود جانتے ہیں۔ کہ ان کو وقت سے پہلے ناشتہ تیار ملتا تھا۔ ٹھیک ایک بجے نوکر کے ہاتھ دفتر کھانا بھیج دیا جاتا تھا۔ اب جب وہ دفتر سے واپس گھر لوٹتے تو میز پر چائے کا سامان لگائے اس کی منتظر ہوتی۔ جب وہ اندر داخل ہوتے تو خادمہ کا لباس زیب تن کئے دروازے تک آجاتی۔ اور اس سے دفتر سے لائے گئے کاغذات کا پلندہ و دیگر چیزیں لے لیتی۔ کپڑے اتارنے میں ان کی مدد کرتی۔ اس کی خدمت اور اس کے سُرخ سُرخ چہرے پر کھیلتا ہوا تبسم دیکھ کر فیض دن بھر کی تھکان کو بھول جاتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ باتوں میں گزار کر وہ شام کا کھانا تیار کر دیتی۔ اور فیض دفتر سے لایا ہوا پلندہ ختم کر دیتا۔۔۔۔۔"

لیکن سندری کے آنے کے بعد کچھ دنوں سے ایسا بھی ہونے لگا کہ

فیض ناشتہ تیار نہ ہونے کی بنا پر دفتر بھوکے جا رہے ہیں۔ کبھی دوپہر کا کھانا نہیں جاتا۔ کبھی رات کے دس بجے دستر خوان بچھایا جا رہا ہے۔ فیض تھکا ماندہ دفتر سے آئے تو سندری چائے کا انتظام کرنے کے بجائے سہیلیوں کے ہمراہ باغ میں ٹینس کھیلا کرتی ——!

راحت کو یہ پسند نہیں تھا۔ لیکن کیا کرتی فیض نے اب سارا انتظام سُندری کے حوالے کر دیا تھا۔ اور صاف کہہ دیا کہ —— "میکے چلی جاؤ ——! وہاں تمہیں ہر قسم کا آرام ملے گا"

راحت سوچ رہی تھی کہ شادی کے بعد لڑکی کا ماں باپ کے گھر کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ پھر میں وہاں کیسے جاؤں! شادی کے بعد شوہر کا گھر ہی عورت کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ اور پھر راحت کو والد صاحب کی آخری نصیحت یاد آئی جو ڈولے میں بیٹھتے وقت اسے کی تھی۔

"بیٹی! یاد رکھو اب سے فیض تیرا سب کچھ ہے۔ ہمارے پاس تم اس کی امانت تھیں۔ اور میں خوش ہوں کہ آج میں یہ امانت لوٹا رہا ہوں۔ بیٹی خبردار! فیض کے دل کو ٹھیس نہ پہنچانا اور نہ ہی اس کے گھر سے باہر قدم رکھنا۔ اب اس کے گھر سے تیری لاش ہی نکل سکتی ہے۔ جاؤ خداوند تمہیں صبر عطا کرے۔ اپنے فیض کی خدمت دل و جان سے کرنا۔ شوہر کی خدمت اور خوشنودی ایک سعادت مند بیوی کی زندگی برسوں اور سالوں بڑھا دیتی ہے"

والد مرحوم کی باتوں کو یاد کر لینے سے راحت کی آنکھیں آبدار ہو گئیں اشکوں سے تر ہو گئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بڑبڑائی۔ ۔ ۔ ۔ شادی کے بعد فیض ہی

اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اس کی راحتوں کا مسکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی امیدوں کا محل ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی خوشیوں کی دنیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے خوابوں کی تعبیر اور اس کی امنگوں کے مالک ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر شوہر سے قرب ـــــ میکے میں ہاتھ پیلے ہو جانے کے بعد لڑکی کا کون رہ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی نہیں ـــــ ٹھیک ہے ۔ میری لاش ہی اس گھر سے نکلے گی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوا اگر میری بسی بسائی دنیا ویران ہو گئی۔ اگر میری زندگی کا چمن خزاں کے ایک جھونکے سے برباد ہو گیا ۔ ۔ ۔ کیا ہوا اگر میرے جینے کے سارے سہارے چھوٹ گئے لیکن صبر و استقلال کہیں نہیں گیا۔ والدین کی نصیحت میں نے پلے سے باندھ کر رکھ لی ہے ؟؟

راحت انہی خیالوں میں غلطاں تھی کہ سُندری نوکر کو پکارتے ہوئے اندر سے نکلی۔ دالان میں راحت بیٹھی تھی۔ اور سُندری کے سینڈل سے اسے ٹھوکر لگی لیکن وہ چلاتی چلی گئی ـــــ "ناک میں دم کر رکھا ہے کمبخت نے ارے صمدو! نہ جانے کہاں مر گیا ـــــ"

اب راحت سے نہ رہا گیا۔ ڈٹ کر بولی سُندری اتنا نہ اتراؤ۔ اپنی خوبصورتی جوانی اور اداؤں پر اتنی مغرور نہ ہو۔ یہ وقت نہیں رہے گا۔ کبھی میں بھی جوان تھی برابر تجھ جیسی اور کبھی میری آواز میں بھی رس تھا میرے میں بھی دلکشی تھی۔ کبھی میں بھی اس گھر کی مالکن تھی اور گھر کا سارا انتظام میرے ہاتھ میں تھا۔ کبھی میں بھی اس گھر میں راج کرتی تھی۔ لیکن تیری

طرح نہیں۔ سُندری اپنے مقام کو پہچانو۔ اور اس وقت کا خیال کرو جب

بیترے یہ دن نہ رہیں گے۔ جب تم میں یہ دلکشی نہ ہوگی۔"

سُندری بھلا کیسے خاموش رہتی۔ رومال سے پسینہ پونچھتے اور دانت چباتے ہوئے بولی۔

"بس بس بکواس بند کرو!۔ بہت سُن چکی ایسے فلسفے۔ اپنی تقدیر کو کوسو جس نے تمہیں یہ دن دکھائے۔ . . .

"بھلا تم کون ہوتی ہو نوکروں کے بیچ میں بولنے اور ان کی ترجمانی کرنے والی"۔ اور راحت یہ جلی کٹی سُن کر خاموش ہوگئی۔ اس کے بدن میں آگ کے شعلے بھڑکے۔ اور غصّے سے اس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن طاقت گویائی نہیں تھی۔ ویسے راحت کے لب ہلے تو ضرور لیکن وہ شکوے اس کے بغیر کسی نے نہیں سُنے ــــــ وہ درد سے بے چین ہوگئی . . . درد اور غم کی لہروں میں بہتے بہتے وہ ماضی کی حسین وادیوں میں پہنچ گئی۔ جس کا تصور اب بھی اس کی بے معنی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔ کھمبے کے ساتھ ماتھا ٹیک کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ اور زار و قطار رونے لگی۔ پاگلوں کی طرح۔ مگر راحت کو چپ کرانے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اسے سہارا دینے والا نہیں تھا۔ کوئی اسے دلاسہ دینے والا موجود نہ تھا۔ ایک رضیہ بیٹی تھی۔ وہ بھی آج کئی دن سے دادی کے پاس چلی گئی تھی۔ اور بٹیا انور ماسی کے پاس ہی پڑھتے تھے ــــــ یونہی شام ہوگئی۔ اور رات بھی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ سُرخ اور سفید دھبے سحر کی تعمیر

میں مگن تھے۔ . . . . اور راحت برابر سوچ رہی تھی۔ اس کو ایک لمحے کے لئے

بھی نیند نہیں ۔ جیسے اس کی خواب گاہ میں تیز شعلے بھڑک رہے ہوں۔
...... اس کا ناکارہ دماغ ماضی کی باتوں کو دہرا رہا تھا جو ایک خوشگوار یادگار بن چکی تھی .... گزرے دن ..... حسین واقعات اس آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔

"جب وہ جوان تھی سندری جیسی !!

سولہ سال پہلے جب وہ زندگی کی اٹھارہویں بہار دیکھنے میں مگن تھی۔ جب وہ اپنی تیرہ سال کی لڑکی رضیہ کی طرح شوخ چنچل تھی ... اسکی زندگی میں انقلاب آیا۔

فیض اس کے ماموں زاد بھائی تھے۔ لیکن وہ اپنے آبا کے ساتھ جو پولیس انسپکٹر تھے۔ گاؤں سے باہر شہر میں ہی رہتے تھے اور کبھی دُور دراز علاقوں میں رہتے ـــــ اور شہر سے گاؤں تب لوٹے جب انٹرنس پاس کر لیا تھا ـــــ اب وہ لڑکا نہ رہا تھا۔ فیض جس کے ساتھ راحت اکثر الجھ جاتی۔ اس کے بالوں کو نوچ ڈالتی۔ تصویریں پھاڑتی اور پہروں باغ میں آنکھ مچولی کھیلا کرتی۔ اب خوبصورت اور دراز قد نوجوان بن کر گاؤں لوٹا ـــــ پرانی یادیں ...... گئی گزری باتیں اور ماضی کے پردے میں کھوئے ہوئے حسین واقعات۔ ابھی تک راحت کو اچھی طرح یاد تھے۔ ان دنوں کی بے تکلفی اور بچپنا۔ ابھی دونوں دلوں میں موجود تھا ـــــ

فیض کے خیال میں ابھی راحت وہی بچی تھی۔ جس کے ساتھ دن بھر کھیلتا اور مٹی کی مورتیاں بنایا کرتا۔ اور جب ایک عرصہ کے بعد فیض نے

راحت کو دیکھا تو کہہ دیا۔

"ارے تم اتنی بڑی ہوگئیں۔ اب تو پہچانی بھی نہیں جاتیں"۔ یہ سنکر راحت شرما گئی۔ اس کی آنکھوں سے شرم وحیا کے چشمے پھوٹ پڑے — اور نظریں جھک گئیں۔۔۔۔۔ سچ مچ بچپن کی دلچسپ اور بھولی بھالی شرارتوں کی جگہ شباب کی سنجیدگی اور حسین خواب لے رہے تھے۔ فیض روزانہ آتے جاتے۔ لیکن اس کی فلسفیانہ میٹھی میٹھی اور وزن دار باتیں راحت کے امن و سکون کو پریشان کرتی رہتیں۔ سونے کے لئے جب راحت بستر پہ لیٹتی تو فیض کے کہے ہوئے جملے اس کی نیند اڑا دیتے اور وہ دیر تک اس کی کہی گئی باتوں کی تہہ تک پہونچنے کی ناکام کوشش کرتی اور نہ جانے کس وقت پہ نیند اسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔۔۔۔۔۔ روزانہ فیض اور راحت سیر کو جاتے اور پھر شام کو گھر لوٹتے کتنے خوش تھے وہ۔۔۔۔۔۔

ایک شام باغ میں کھڑے فیض نے گلاب کی ٹہنی سے ایک خوشنما پھول توڑا اور بے باکی سے راحت کے بالوں میں لگا دیا —!

"کتنا اچھا لگ رہا ہے یہ پھول برسات کی راتوں کی طرح سیاہ اور گھنی زلفوں میں راحت!"

"میرے بالوں میں کس مطلب کے لئے لگایا۔ کسی دوسرے کے بالوں میں لگاتے تو یہ پھول اور بھی بھلا لگتا اور میں بھی تمہارے سا تھ تعریف کرتی۔" راحت یہ کہہ کر مسکرائی۔

"کس کا ارادہ ہے"؟ فیض نے بے چین ہوکر کہا "ہماری بھابی کے

اور کس کے۔"

یہ کہہ کر راحت باغ سے بھاگ کر اپنے مکان کے برآمدے میں آگئی۔ فیض بھی پیچھے پیچھے آیا اور بولا۔

"میں کیا جانوں!" "یہ آپ ہی جانتے رہوں گے۔" راحت نظریں جھکا کر بولی۔

راحت۔" فیض بولا۔ "یاد رکھو میری زندگی کے افق پر صرف ایک چاند ابھر سکے گا۔ صرف ایک چاند، اور وہ چاند تم جانتی ہو کون ہے۔"

"کون ہے۔ ذرا ہم بھی جانیں۔" راحت بولی۔ "ارے پگلی! تم جانتی ہو اس چاند کو ــــ ذرا اپنے دل سے مشورہ کرو۔ وہ کہتا کیا ہے۔"

"نہیں فیض آپ اور مجھ میں کیا میل۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم آپس میں رشتہ دار ہیں اور اکٹھے پلے ہیں۔ لیکن ہماری زندگی کی راہیں جدا ہیں ــــ کہاں آپ فیشن ایبل اور اپ ٹو ڈیٹ نوجوان ــ کافی پڑھے لکھے۔ اور کہاں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کمانے والا دفتری بابو ــــ اور کہاں میں گاؤں کی گنوار لڑکی ایک دو کتابیں پڑھی ہوئی۔ آپ اور مجھ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے ــــ فیض آپ کے لئے تو کوئی کافی پڑھی اور خوبصورت لڑکی ہونا چاہیئے۔"

"اف کتنی بھولی بنتی ہو راحت۔" فیض بڑبڑایا۔ "محبت میں پڑھائی اور اونچ نیچ یا مال و دولت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کاش تم میرے شکستہ دل کی گہرائیوں میں جا کر ارمانوں کا جائزہ لیتیں تو پتہ چلتا کہ میں

تمھیں کتنا چاہتا ہوں۔ یقین جانو راحت! تم میری روح ہو...... تمھارے بغیر میں ایک زندہ لاش ہی تو ہوں"

اتنے میں راحت کی امّی آگئی اور سلسلہ کلام منقطع ہو گیا —

— راحت معاملے کو جان گئی ...... اور ساری رات نہ سو سکی۔ سوچتی رہی ...... "کیا میرے دل کا طوفان فیض کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ کیا اس کا دل مجھے پانے اور حاصل کرنے کے لئے بیقرار ہے۔ کیا اسکے ارمان بھی میری طرح محبت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہیں"

...." ہنہ! نہیں یہ سب دھوکا ہے۔ سراسر دھوکا اور فریب۔ فیض میرا نہیں بن سکتا۔ فیض سورج ہے۔ اسے فلک کی ہی ضرورت ہے۔ فرش زمین اس کے لئے موزوں نہیں — وہ پھول ہے، شاخ گل ہی پر شگفتہ رہ سکتا ہے۔ دامن گل چین میں مرجھائے جانے کا اندیشہ ہے — فیض شمع ہے انجمن ہی اس کی ضیاباری کے لئے موزوں جگہ ہے۔ بیابان میں گل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ — اور وہی فیض مجھ سے محبت کرے۔ ناممکن! ناقابل یقین — وہ میری تلخ اور نامراد زندگی میں شریک ہو کر اپنی عشرتوں کا خون نہیں کر سکتا ہے۔ اور پھر پھولوں سے لدے ہوئے کنج کو چھوڑ کر کانٹوں کی باڑھ میں نہیں آسکتا — یہ سراسر فریب ہے۔ ڈھونگ ہے...... کہکشاں کے دہکتے ہوئے ستارے کا زمین پر ٹمٹماتے ہو۔ چراغ سے کیا تعلق۔ اتنا کچھ راحت سوچتی رہی — لیکن دل نے تردید کر دی

"پگلی! کیا سے کیا سوچتی ہے تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ محبت ان چیزوں سے

بالاتر ہوتی ہے۔ محبت چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ اٹھے ہوئے طوفان کو روک سکتی ہے...... پہاڑوں کو مسمار کر سکتی ہے......۔ دو دلوں میں محبت کے عہد و پیمان جب ہوتے ہیں۔ تو ان کا ملاپ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس دنیا میں نہیں۔ تو دوسری دنیا میں۔ جہاں کوئی کسی کا حق نہیں چھین سکتا۔ جہاں انصاف و رحم کی حکمرانی ہے۔

امکانات پر غور کرنے پر زمانہ گزر گیا — اب وہ وقت بھی آ گیا جب راحت دلہن بنی — اسے مہندی اور زیورات سے سنوارا گیا۔ اور ڈولی پر بٹھا کر فیض کے حوالے کر دی گئی۔ کتنا حسین ملاپ تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ایک دوسرے کے لئے ان کے دلوں میں کتنی ہمدردی، اور محبت تھی۔ اور جب دو بچوں کا جنم ہوا تو گھر میں گھی کے چراغ جلائے گئے۔ خوشیوں کی انتہا ہو گئی۔ فیض نے دونوں موقعوں پر گھر کو دلہن کی طرح سجایا۔ جیسے اسے مسرت اور شادمانی کا بھرپور خزانہ ہاتھ لگا ہو اور پھر جب راحت بیمار پڑی تھی۔ تو کس طرح فیض نے اس کی تیمارداری میں صبح و شام ایک کر دئیے...... پانی کی طرح علاج کے لئے روپیہ بہایا۔

الغرض دونوں کی محبت کے پھول زندگی کے بیکراں سمندر میں مل کر بہنے لگے اور پھر موت نے بہتے ہوئے پھولوں کو جدا کر دیا۔ اور ایک تیسرا پھول آ ٹکرایا۔

یہ سندری کا وجود تھا — راحت کے لئے کس قدر سوہان روح تھا۔ جب اس کی نگاہوں کے سامنے فیض کی زندگی کے افق پر دوسرا چاند ابھر رہا تھا۔ اور اس کی قسمت کا جگمگاتا ہوا ماہتاب اپنی پوری طاقت آب و تاب سے

چمکتے چمکتے بدنصیبی کی گھاٹیوں اور اونچی نیچی ویران پہاڑیوں کے درمیان لڑکھڑاتے ہوئے آخر غروب بھی ہوگیا۔ یعنی راحت کی سہانی صبح کو تاریک شام کے پردوں میں چھپنا پڑا ۔ بے بسی اور بے کسی کے پردوں میں ...... جہاں اب پھر طلوعِ آفتاب نہ ہوگا۔ اس کی زندگی کا دل آویز پھول مرجھانے لگا۔ بربادی سے بھرپور خزاں کے جھونکے اس کے پربہار گلستان میں بڑی تیزی کا سے چلنے لگے ـــــ

"راحت میں چاہتا ہوں تمھارے آرام کا سامان کردوں۔" ایک دن فیض نے کہا۔

وہ کیسے"۔ راحت کا ماتھا ٹھنکا ـــ چند دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ فیض میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اپنے دو بچّوں کے علاوہ خود اس سے بھی انجانے رہنے لگے تھے ۔ اور دفتر کے کام میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ تم بُرا تو نہ مانو گی راحت" فیض سہم گئے، مگر کہہ ہی گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ...... وہ رک گئے اور کچھ دیر بعد کہا۔ میں راحت دوسری شادی ـــ"

راحت دوسری شادی کا لفظ سنتے ہی سناٹے میں آگئی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا ـ تن بدن پھنکا جانے لگا اور ہوش وحواس جاتے رہے۔ لیکن دل پر پتھر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"خوشی سے کرلو۔"

یہ الفاظ راحت کے ہونٹوں نے ضرور ادا کئے۔ لیکن یہ راحت کے دل کی آواز نہیں تھی ــــ اس کی ساری خوشیوں اور اس کے بچّوں کی مسرّت

کی نزاع کے عالم میں کراہ تھی۔ ایک دل دوز چیخ...... جو فیض جیسے سنگدل کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اف اسے ایسا جان پڑا جیسے، کوئی اس کی بسی، بسائی دنیا جلا کر راکھ کر دیتا ہو۔ اور چلاّتا ہو ـــــ جاؤ راحت اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ تمہارے دن تو بیت گئے۔ تمہاری دنیا پرانی ہو گئی تھی، اب نئی دنیا بسانا ہے۔ نئے ساز و سامان کے ساتھ ـــ باغ کا ایک بھولا ہوا منظر۔ راحت کے ذہن کی تاریکی میں ابھرنے لگا ـــ راحت دیکھ رہی تھی اور فیض کہہ رہا تھا ـــــ

"میری زندگی کے افق پر صرف ایک ہی چاند ابھر سکے گا"

راحت ساری رات سو نہ سکی اور پھر کئی راتوں تک فیض کے متعلق سوچتی رہی...... چلاتی رہی...... اور خوب واویلا کی۔ لیکن اس کے دلدوز چیخوں کو اس سوسائٹی میں سننے والا کون تھا...... کوئی نہیں...... وہ رات آخر آئی اور چلی بھی گئی ـــ جب راحت کی طرح سندری بھی دلہن بنی اور فیض کے شبستان میں پہلی بار، اور ہمیشہ کے لئے داخل ہو گئی ـــ لیکن سندری راحت نہ تھی۔ سندری جوانی اور خوبصورتی کا جنون لے کر آئی تھی۔ اور راحت جوانی و محبت کی حدوں کو پار کر کے اب باوفا عورت بن چکی تھی۔ سندری کے دل میں جذبۂ انتقام کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ لیکن راحت کے دل میں ہمدردی اور ایثار کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سندری زہر تھی تو راحت امرت ـــ راحت اب بھی خوبصورت اور دلکش چہرے کی مالک تھی۔ چہرے پر غم کے استبداد سے کسی قسم کے نقوش نہ ابھرے تھے۔ لیکن سندری

کے آنے سے اب اس کے لئے یہ دنیا جہنم بن گئی تھی۔

سندری پڑھی لکھی تھی۔ اور جیسے کالج کی لڑکیاں گھریلو زندگی! توہین سمجھتی ہیں اسی طرح سندری بھی گھریلو کام کرنے کو توہین سمجھتی تھی۔ اسے گھر کے کام سے کیا واسطہ۔۔۔۔۔۔

راحت صرف دیکھا کرتی۔۔۔۔۔۔ فیض دفتر جانے کی تیاریاں کر رہا ہوتا لیکن سندری ابھی تک لحاف میں انگڑائیاں لے رہی ہوتی۔

راحت کا دل اب بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ فیض کی خدمت کرے اس کے کسی کام آسکے۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ اب اس گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ نہ تھی! اپنی مرضی کی مالک نہ تھی۔۔۔۔۔ اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے و سدھارنے کی خاطر وہ ہر طرح کی سختی و ہر قسم کا ظلم برداشت کر رہی تھی۔۔۔۔۔ آخر اس کے سینے میں ایک ماں کا دل تھا ایثار و قربانی سے لبریز۔

کچے گھاؤ

ہاتھ میں تھامے مراسلے کو وہ متعدد بار پڑھ چکی۔ اور کئی بار اس نامہ
کے مواد کو کھنگالنے کی سعی کی تھی...... اس کے زیر و بم کا تجزیہ کرنا چاہا اور
آنکھیں سُرخ کی تھیں۔ دل میں کرب و بے قراری نے ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔
اس گرداب میں اب اسکے ارمانوں کی ناؤ ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور رگ رگ سے
بے چینی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ اس نے نامہ کو ایک بار پھر پڑھنا چاہا۔ احمد کا لکھا ہوا
خط تھا۔ مگر نزہت کا دل ماننے کو تیار نہ تھا۔ کہ خط میں لکھی ہوئی باتیں سب کی
سب سچ ہیں اور صداقت پر مبنی ہیں۔ اور اس خط میں سوانگ یا لغویت کا نام
ونشان بھی نہیں ہے۔ اس نے پھر اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں رومال سے خشک
کر لیں۔ اور مضطربانہ لہجہ اپنائے خط کو پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

"نزہت..... امید کہ میرا یہ نامہ تمہیں عافیت سے پائے گا۔ میں
ابھی بقید حیات ہوں۔ اور بقدر ضرورت خیریت سے بھی۔ یقین جانو میں
زندہ ہوں۔ مگر میری حالت زندہ لاش سے کسی طرح کم نہیں نہ جانے کس
بھر دمہ اور کس امید پر اب بھی زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں جبکہ زندہ رہنے

کے تمام لوازم مجھ سے فراریت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اور ایک عرصہ سے زیست کی تمام راہیں مسدود پڑی ہیں۔ یقین جانو! میں بسا اوقات سوچا کرتا ہوں۔ کہ میں کیونکر زندہ ہوں۔ کیا کروں یہ لوک ہے۔ اس جگ میں من مانی کام نہیں کرتی ہے۔ یہاں انسان اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر پاتا۔

جب بھی سنسار میں کسی ایک نے اپنی آرزو اور خواہش کے جھنڈے گاڑ دینا چاہے۔ تو نوشتہ تقدیر اس کے کرتبوں پر قہقہے لگانے میں پیش پیش رہتی ہے۔ برگشتہ بختی انسان کو کچھ بھی نہیں کرنے دیتی۔ اس خاطر ہمارے اس جیون میں بہت سی باتیں الٹ بھی ہو جاتی ہیں۔ جن کی ہمیں توقع ہی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں کو ماننے کے لیے ہم مجبور ہیں۔ اس نامہ کی گہرائیوں میں جھانک کے تمہیں ضرور دکھ، درد اور ناامیدی سے واسطہ پڑے گا۔ تمہارا دل ٹوٹ بھی جائے گا۔ عین ممکن ہے۔ کہ تم مجھے کوسو گی۔ گالیاں دو گی۔ اور پرلے درجے کا مکار جان کے میرے نام پر تھو کرو گی۔ لیکن مجھے امید قوی ہے۔ کہ میری مجبوریوں و لاچاریوں سے بھرے نقیصے کی عقدہ کشائی کرنے اور جائزہ لینے پر تم مجھے نردوش پاؤ گی۔ مجھے بے گناہ خیال کرو گی۔ لاچاریوں نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔ میری جیون نو کا کو ساحل کی تمنا میں بھنور سے ہم آغوش کر کے رکھ دیا۔ جہاں وہ موجوں کی گود میں بے بسی کو اپنائے زندگی کی آخری گھڑیاں شمار کر رہی ہے۔

مجھے بھروسہ تھا، اعتماد تھا، اپنی محبت پر فخر تھا، اپنی الفت پر اور یقین

تھا کہ تمہیں پا کر تم سے منسلک ہوئے۔ میری ویران و مقفاوم زندگی میں پھر سے بہار آجائے گی امن۔ پھر سے اکٹھان اس میں بسیرا کرے گی۔ اور میں ساز الفت پر زندگی کا ایک میٹھا اور سُریلا گیت گنگناؤں گا۔ تم ناچو گی۔ اور ایک وجد سا طاری ہوگا میں سمجھتا تھا۔ کہ تم سے وابستگی اختیار کیے میرا مہمل جیون سورگ بن جائے گا میرے اجڑے چمن میں پھر سے شادابی و تروتازگی اپنے ہونے کا اعلان کر دے گی۔ اور ہم پھر سے ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ جس میں خوشی و مسرت مضمر ہو۔ اور سب سے بڑھ کر تسکین قلب حاصل ہو۔ دل کی ڈھارس ہو جو اس بے ثبات دنیا میں انسان کے لیے سب سے بڑی دولت ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اس دولت سے فیض یابی نصیب نہ ہوئی۔ ہمارا سوچا ہوا سب مٹی میں مل گیا۔ میں تم کو ہزار کاوشوں کے بعد بھی نہ پا سکا۔ کیا بتاؤں مجھے تم سے الگ کیوں کیا گیا یقین کرو! ان لوگوں نے میرے سب ارادے زمین دوز تہ خانوں میں دفن کر دیئے۔ میرے آگے بڑھنے کے راستے مکمل طور سے بند کر دیئے اور مجھے کچھ بھی نہیں کرنے دیا۔ مجھے سوچنے کا موقع بھی نہ ملا میری سلجھی ہوئی راہوں کو انہوں نے تاریکی سے مضمر دیا۔ اندھیرے میں ادھر اُدھر بھٹکے اور ٹھوکریں کھاتے آخر کار مجھے ان لوگوں کے راستے پر چلنا پڑا مجھے سماج اور خاندان کی عزت، گھر کی حالت اور والدین کی چاہت کا واسطہ دیا گیا۔ میرے ہمدرد مجھے تلقین کرنے لگے۔ کہ بزرگوں کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش نہ کرنا۔ انہوں نے ناک کی سلامتی چاہی۔ وہ بیگ؟ جیت حاصل کرنا چاہا۔ ہمنواؤں نے نہ جانے کیوں میرے بزرگوں کی جانب داری و طرفداری

کرنے میں اپنی خوشنودی جان لی۔ بہرکیف ان سب لاچاریوں نے یکجا ہو کر میری امیدوں کا پانی پھیر دیا۔ میری تمناؤں کے بغیچے کو نذر آتش کر دیا۔ میری آرزوؤں کے محل کو کھود کے رکھ دیا۔ میری ساری آشاؤں کا خون کیا اور میں خلاف امید رفیقہ کو اپنی زندگی میں لانے میں کامیاب ہوا۔ جو تمہارے اور میرے مابین ایک فصیل کا کام کر گئی۔ جس فصیل کو سر کرنا یا پاش پاش کرنا بھی اب میری دسترس میں نہیں ہے۔

رفیقہ جس نے میری تمنّا کو نظر انداز کئے اپنی چاہ کی تکمیل کے لئے دنیاداری کا بجا طور سے ساتھ دیا۔ جس نے دنیا والوں سے مل کر میری زندگی کو مجھ سے الگ کر دیا۔ میرا دل رو رہا ہے۔ آشاؤں کی قسمت سو گئی ہے۔ کامنائیں تڑپ کر مر چکی ہیں۔ حسرتیں سسک سسک کر دم توڑ گئیں اور اور میں خود شوریدہ سری سے ہمکتا رہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ چھن گیا ہو۔ میں لٹ گیا ہوں تم کو نہ پا کر میں نے کچھ بھی نہ پایا ہے

تم سے بچھڑ کے زیست کی لذت فنا ہوئی

تم کیا گئے کہ سو گئیں خوشیاں مزار میں!

مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ یہ سندر و عالیشان محل یہ خوش الحان پرندوں کا چہچہانا۔ بل کھاتی ہوئی ندیاں۔ یہ گگن کی وسعتوں و رفعتوں کو چھوتے ہوئے پہاڑ۔ قدآدم درخت۔ یہ پھول سے لدی ہوئی کیاریاں اور یہ پر آشوب زندگی یہ سب ساتھ نبھانے والے سب مجھے کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں۔

میرے ہاتھ آج کل لال ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ مہندی سے رنگے ہیں نہیں بلکہ آشاؤں کے خون سے ـــ مجھے شما کرنا دیوی اپاپ جانے مجھے معاف کر دینا۔ اگر ہو سکے تو میری یاد کو کبھی بھول جانا۔ اسے کبھی اپنے دل سے نکال باہر کر دینا اور ساتھ میں ان خوابوں اور سپنوں کو بھی جو ہم تم ساتھ دیکھا کرتے تھے ـــ افسوس اپنا دل میں چیر کر نہیں دکھا سکتا ـــ ورنہ تمھیں اس حقیقت کا ثبوت ملتا کہ احمد اب بھی تیرا ہے۔ میں واقعی اب بھی تیرا ہوں مجھ پہ تمھارا ساتھ چھوٹ جانے سے کیا گزر رہی ہے۔ میں ہی جانتا ہوں یا میرا جنم داتا ـــ اور کوئی اگر تو وہ تمھارا دل:

ـــ جان سے عزیز زینت! عمر دراز ہو۔ سکھی رہو۔ یہی میری تمنا اور آرزو ہے۔ اور یہی میری دعا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خوش و خرم زیست کی الجھنوں سے سبکدوشی اختیار کرنے میں کامیاب رہو۔ اور شادماں زندگی کی ہر چھوٹی بڑی بازی جیت جاؤ۔ میری رہی سہی عمر تمھیں لگ جائے۔ کاش ایسا ہوتا۔ . . . . . یاد ہے آج سے دو سال قبل میں نے یہی دعا کی تھی۔ مگر میں ان دنوں خود پتھر بن چکا تھا ـــ وقت و زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر میں خود ایک ٹھوکر بن چکا تھا ـــ میں سچ کہتا ہوں۔ انسانیت مر چکی تھی اور میں اس کا جنازہ اپنے نازک کاندھوں پر بہا آیا تھا ـــ سمندری لہروں میں اس جنازہ کو ساگر کی موجوں کی نذر کیا گیا۔ وہ بھی چاندنی رات کو ـــ وہی چاندنی رات جس رات تمھارا اور میرا ملاپ ہوا تھا۔ ہمارا اختلاط جنم پا گیا تھا۔ یاد ہے۔ میرے دیدوں میں بے پناہ اشک دیکھنے۔ تمھارا دل بھر آیا تھا۔ تمھارے

چہرے پر پژمردگی کے اثرات جنم پا گئے تھے ۔ نہ جانے کیوں تم بھی رو رہی تھیں
ہم دونوں بلک بلک کر رو رہے تھے ـــــ انسانیت ڈوب رہی تھی .....
شرافت ساگر کی گہرائیوں میں اپنا مقام حاصل کرنے میں منہمک تھی۔ اور
میں بت بنا سامنے کھڑا تھا لہریں چیخ رہی تھیں۔ انسانیت پکار پکار کر
مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں ہرن کو اپنا لوں۔ کود پڑوں۔ اور اسے بچا لوں!!
موجیں اس بات پر مصر تھیں کہ میں بھی کبھی انسانیت کو ڈوبنے سے بچا لوں
لیکن میں کچھ بھی کرنے سے رہ گیا۔ نزہت میں مر چکا تھا۔ موت سے قبل
ہی موت کی آغوش میں سو چکا تھا ـــ دل کا دیا بجھ چکا تھا۔ آنکھوں کی
بصارت جواب دے گئی تھی۔ زمانے کی بدلتی روش کے تھپیڑے کھا کھا کر میں
زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ایک ہوا کے جھونکے
سے گل ہونے کو تھا۔ بالکل تمہاری طرح میں بھی کبھی زندہ تھا۔ لیکن وہ زندگی
دائمی نہیں۔ بلکہ عارضی تھی۔ خوشی چند لمحوں کی مہمان تھی۔ وہ مجھے وقت پر دغا
دے گئی، وقت ضرورت میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اور میں تنہا رہ گیا۔ چاندنی میں
ملبوس رات کو لہریں کنارے سے ٹکرا رہی تھیں اور واپس ہو رہی تھی۔ ناامید
واپس لوٹ رہی تھیں۔ چاند برابر ہنس رہا تھا۔ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میری
ہنسی اڑاتا تھا۔ اس دل لگی کے باعث میں رونے لگا تھا آنسو ریت پر
گر گر اس میں جذب ہو رہے۔ دل میں ہیجان تھا۔ کتنا دلخراش جانکاہ منظر تھا
وہ میں گھبرا رہا تھا۔ خوفزدہ نظروں سے ان ہرنوں کی جست دیکھ رہا تھا۔ وہ

کھڑا رو رہا تھا۔ صدائے بازگشت اب بھی میرے کانوں کے پردے ہلانے میں محو تھی۔ ماضی کے واقعات اب بھی میرے سامنے تھے۔ بلکہ محو رقص تھے۔ میرے دل کو ان کا ناچنا بھی شاق گزرتا تھا۔ وہ میرے تن بدن میں آگ لگا رہے تھے وہ میرے مردہ ارمانوں کو پھر سے اجاگر کرنے کی ناکام کوشش میں مگن تھے۔ پرانی یادوں کو پھر سے میرے روبرو لانا چاہتے تھے۔

میں برابر رو رہا تھا— ہاں! ہاں! اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ میں کم ظرفی کا شکار بن رہا تھا— میں زار و قطار رو رہا تھا— شاید وہ بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر جو آن کی آن میں میرے دل و دماغ میں آ پڑا تھا— ایک ٹھوکر لگی کہ دل آئینے کی طرح چور چور ہو گیا۔ مجھے جان پڑتا تھا کہ جیسے چاروں اور سے قہقہے لگائے جاتے تھے۔ بلند قہقہے! مجھے تڑپانے اور جلانے کے لئے یہی وجہ تھی کہ میں ڈھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ نزہت تم اپنے دل سے پوچھو۔ میں کس طرح دیکھ رہا تھا۔ تم کو، ساحل کو، دریا کی روانی کو، چاند کو، موجوں کو اور پھر اپنی پھوٹی ہوئی تقدیر کو! انسانیت کو جسے میں نے بہا دیا تھا۔

"میں مرنا چاہتا ہوں" میں بے ساختہ چلایا— اور دریا میں کودنے لگا۔ مگر نزہت بخدا تم ہی تھیں جس نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ تمھاری یاد نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔ تمھاری چاہ نے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روکے رکھا۔ لیکن کیوں؟ میں تو مرنا چاہتا ہوں۔ مرنے کی نیت سے اس دریا کی اٹھتی ہوئی لہروں سے قریب ہو گیا تھا۔ میں اس دنیائے بے ثبات ہر لطافت کو تیاگ دینے کی ... آغوش ... چاہتا تھا۔ میں

زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں زندہ تھا ہی کب؟ میں تو مر چکا تھا۔ میں صرف موت کی لہروں سے ملنا چاہتا تھا۔ اچھلتی کودتی زندہ لہریں مجھ سے ملنا چاہتی تھیں ــــ وہ بھی چاند کے لباس میں ملبوس، نقرئی چادر کو اوڑھے مجھ سے بغلگیر ہونے کو بیقرار تھیں۔ انہیں اس وقت میری بے بسی پر رحم آیا تھا۔ میری بدحالی کو انھوں نے بھانپ لیا تھا۔ کیا تمھیں یاد نہیں ــ متعدد بار لہریں باہر بھی آ گئیں۔ کیونکہ وہ اپنے ڈولے میں بٹھا کر مجھے لے جانا چاہتی تھیں۔ اس دنیا کے کون و مکان میں جہاں زندگی کا دوسرا نام محبت ہے۔ جہاں دنیا نو امیدوں کا بس نہیں چلتا۔ جہاں کسی کے ارمانوں کو لوٹے۔ اس کے دائرہ حیات کو تنگ کرنا گناہ عظیم تصوّر کیا جاتا ہے۔ ڈولا میری حیثیت بڑھا رہا تھا۔ ڈولا نما ارتھی کہوں تو موزوں رہے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ افسوس اس وقت تمھاری یاد مجھے باز نہ رکھتی ــــ تو آج کل یہ عتاب، جلن، سختی برداشت نہ کرنا پڑتی۔ نزہت ذرا اس دن کی طرف دیکھو جس دن ہم نے ایک دوسرے کا جیون ساتھی جیون سنگی بننے کی قسمیں کھائی ہیں۔ جس دن میری زندگی میں پھر سے زندہ رہنے کی جنبش جنم پا گئی تھی۔ صرف تمھاری وجہ سے تمھارے وجود ہی کے باعث میری امنگوں نے پھر سے ناچنا شروع کر دیا۔ تمھاری ہی وجہ سے میرے ہونٹوں کو تبسم نے چوم لیا تھا۔ اس دن مجھے یاد ہے خلاف معمول تیز ہوا چل رہی تھی۔ لیکن فضا میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اور کرۂ ہوا میں افراتفری پھیل گئی۔ ریت اڑ رہی تھی اور میری بدحالی میں مست ہو کر اس سے بغلگیر ہو رہی تھی۔

اخاہ! کیا ہوگیا وہ دلفریب وہ زندہ سماں وہ ساعت اور وہ نظارہ۔ وہ نورانی وتابانی ماحول جبکہ ہر شے نور سے منوّر تھی۔ وہ چوری چھپے ملنا ایک دوسرے کا رومال حاصل کرنا .... پھر بمثل "عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے" لوگوں نے ہمیں کوسا۔ ہمارے ارمانوں کا خون کرنا چاہا۔ بلکہ کر بھی دیا۔ مجھے آوارہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ کوچہ گرد کے نام سے نوازا گیا۔ ذلیل ثابت کرنے کی تدبیریں ہوئیں۔ کیا ظلم نہیں تھا اگر نہیں تو مجھے بغاوت کرنے پر کیوں باغی کہا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمھیں پانے کے لئے بے لوث و بے غرض محبت کا علم بلند رکھنے کے لئے سماج کے بے نام اور اوچھے قوانین کے خلاف آوازِ حق بلند کر دی۔ میں نے بے جا رسوم کے خلاف صدائے احتجاج سے کام لیا۔ اور بے نام و باغرض اصولوں کو زیر کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ ان بے نام اصولوں کے خلاف جن کی زد میں آئے۔ انسانیت کا خون ہوتا تھا۔ شرافت چیخ اٹھتی تھی۔ مروّت دم توڑ رہی تھی اور پاک و پوتر محبت کے شیدائیوں کو تڑپنے کا زرّیں موقع ہاتھ لگتا تھا۔ لیکن اس کار ثواب کو اپنانے مجھے باغی کا خطاب ملا۔ لوگوں نے مجھے نافرمان جان لیا۔ جو کہ عبث و غلط تھا۔ مجھ پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ ہاں لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھاتے تھے اور آوازے کستے تھے۔ آخر کیوں؟ مجھے اس طور سے تڑپایا جا رہا تھا۔ میں نے کون سا جرم اپنایا ہے۔ یا کون سا قصور مجھ سے سرزد ہوا تھا۔ زبان کھولنا میرا کام ہی تھا۔ اور زبان کو جائز طریقہ پر کام میں لانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا کون میرے فطری حق کو مجھ سے چھین سکتا تھا___

انسانوں کی طرح زندہ رہنا ہر انسان کا فرض اولین ہے۔ تو پھر مجھے اس حق سے محروم کیوں رکھا جاتا تھا۔ مجھے اس حق سے الگ رہنے پر مجبور کیوں کیا جارہا تھا ——

نزہت نہ جانے میں کیا کیا لکھ گیا ہوں۔ قلم، کاغذ اپنا لئے دماغی توازن کھونا بھی میرے لئے معمول میں شامل ہوا ہے —— پھر —— رفیقہ سے ہم بستگی اختیار کر لینے پر ...... اس کا قرب حاصل ہونے پر مجھے اب محسوس ہوا ہے۔ جیسے میرے سامنے ایک ڈائن دلہن کے لباس میں کھڑی تھی۔ ...... چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ ڈراؤنا اور دہشناک اندھیرا۔ .... جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ دور دور حد نگاہ تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس تاریکی کو فرد کرنا چاہتا تھا۔ میں اس اندھیرے سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ اور میری خواہش تھی کہ اندھیرا ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے اور پھر سے فانوس میری تاریک دنیا میں ضوفگن ہو جائے۔ جس کی روشنی کی مدد سے میں زندگی کے روشن پہلو کو دیکھ پاتا ...... میں اپنی ضیا پاشی کا آرزومند تھا۔ جو چاند کی طرح سدا میری زندہ میں زندہ جاوید رہتی۔ میری نزہت! اس وقت پھر ہوا میں ارتعاش آگیا تھا۔ میرے بال اڑ رہے تھے۔ اس آوارہ بادل کی طرح اڑ رہے تھے، جو آسمان کی وسعتوں میں بے ارادہ بے مطلب گھومتا رہتا ہے۔ اور لوگ حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہیں ...... میرے بدلے ہوئے خدوخال میری پریشان حالی کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ اور میرا اترا ہوا چہرہ میری تباہ حالی کا مظاہرہ کر رہا تھا

اور میرے سوکھے ہوئے ہونٹ دل کے مردہ پن کے ضامن تھے۔ رفیقہ میری اس بدحالی کا سبب ڈھونڈنے کے لئے مجھ سے ایک بار کہہ اٹھی تھیں "کیا تمھیں یہ بدحالی اب بھی پیاری ہے۔ جو میرے ہوتے ہوئے بھی پریشان رہا کرتے ہو۔ آخر اس اداسی کا باعث ؟"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور دیتا بھی کیا۔ جبکہ میں اس کو عورت کے روپ میں ایک ناگن تصوّر کر رہا تھا۔ وہ میرے لئے ناگن سے کسی طرح کم نہ تھی۔ افسوس ایک کلی میرے لئے ناگن بن گئی تھی۔ شریک حیات میرے لئے ڈائن بن گئی تھی۔ حالات میرے لئے قید خانہ تھے۔ اور میں اس میں قیدی کی حیثیت رکھتا تھا۔ سارا زمانہ میرے لئے ایک پنجرہ بن گیا تھا۔ اور میں اس پنجرے میں نیم گھائل پنچھی کی وقعت رکھتا تھا۔ میں رفیقہ کو اس کے استفسار کا جواب بھی نہ دے سکا۔ کافی دیر ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ضرور تھے۔ لیکن پھر بھی کچھ کہنے کی سکت نہ تھی۔ طاقت گویائی مجھ سے جیسے سلب کر دی گئی ہو۔

شکایت میرے ہونٹوں پہ تھی۔ لیکن میں بول نہیں سکتا تھا۔ دل میں درد تھا۔ رگ رگ میں ہیجان اور جلن۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے پھر مرنے کا ارادہ باندھا تھا۔ میں مر جانا چاہتا تھا۔ اس لوک سے اٹھنا چاہتا تھا۔ میں اپنے کو برباد کرنے کی خاطر کیا سے کیا سوچا کرتا تھا۔

"مرنے سے زندگی کی مصیبتیں کم نہیں ہوتیں"۔ رفیقہ کی آواز نے ایک بار پھر میرے احساسات کے ستونوں کو زور زور سے ہلا دیا۔

لئے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"سرتاج! زندگی کا میدان بہت وسیع ہے۔ زندگی کو اس کوتاہ نظری سے مطالعہ نہ کرو۔ دکھ سکھ، آس و نراشا، امید و بیم خوشی و غم اور راحت مصیبت سب باری باری دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس زندگی سے اس طرح منحرف ہونا انسان کا کام نہیں ہے۔ کئی بار ہارنے پر بھی انسان کو ہارے ہوئے سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ اس زندگی میں ہار ہی جیت کا دوسرا نام ہے۔ اک بار اس زندگی کے ساگر میں کود کر دیکھو کہ کس قدر چین و سکون اس کی گہرائیوں میں جانے سے حاصل ہوتا ہے"۔

"لغو! یہ سب جھوٹ ہے۔ سب دھوکا اور سراب"۔ میں بڑبڑایا۔ یہ دھوکا نہیں سرتاج بلکہ تم اسے سراب جان کر خود کو دھوکا دے رہے ہو"۔

"بکواس بند کرو"۔ میں آپے سے باہر ہو کر بیساختہ بول اٹھا۔ میری نگاہیں ایک دم اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے لہولہان چہرے پر جم گئیں۔ اور میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ قفل سکوت توڑتے ہوئے پھر بولی"۔

"بخدا اگر تم ہمت اور حوصلے سے کام لو تو اپنی وقوت اور عظمت کو پہچان لو گے۔ میں یقیناً تمھاری مساعدت۔ تمھاری زندگی میں انقلاب لا سکوں گی۔ مجھ پر یقین کرو سرتاج!"

"انقلاب" ہا ہا ہا! رفیقہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو! ہاں ہاں! (انقلاب) اگر دس اگر تم میرا ساتھ دو تو میں مہ پریشانی، یہ اداسی، یہ مایوسی اور نا امیدی بدل سکتی ہو۔

خوشی میں، راحت میں، قہقہوں میں اور سکون میں ایک نئی دنیا جنم پائے گی۔ ایک نئی زندگی ہو گی۔ خوشی اور مسرت سے لبریز زندگی جس زندگی میں حرکت ہو اور جنبش ہو۔ تم مجھ پر یقین کر لو میں تمھاری دشمن بن کر نہیں آئی ہوں۔ بلکہ تمھاری شریک زندگی بن کر اس خانہ میں قدم رکھ کر آئی ہوں۔ میں نے اسی سابقہ انداز میں کہا۔

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔ سبز باغ مجھے دکھانے کی کوشش نہ کرو۔ ایسا مت بتاؤ۔ میری زندگی میں کبھی شادابی جنم نہیں لے گی۔ مجھے اپنی بد قسمتی پر ناز و فخر ہے۔ میری زندگی میں انبساط و مسرت دیکھنے کو نہ ملے گی۔ اس میں صرف دکھ درد اور بے بسی سمٹ کر آگئی ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھے فریب نہ دو۔ میں اس ضمن میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ تم چپ رہو۔ جھوٹی تسلیاں دینے سے کیا حاصل۔ نزہت بھی ایسا ہی کہتی تھی۔ کاش میں مر جاتا۔" اس پر وہ گویا ہوئی۔

"اف! اب بھی تم نزہت کو نہیں بھولے۔ کیا اب بھی اس کی یاد تمھارے دل میں بسی ہوئی ہے۔ اب بھی اس کا غم تمھیں کھائے جا رہا ہے۔ سرتاج اپنے کبھی تو! مجھے بھی پہچاننے کی سعی کرو۔ مجھے یوں حقیر جان کر ٹھکرانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھ سے وابستہ ہوئے تمھیں زندگی کو جاننے کا شرف حاصل ہو گا۔ موت کا خیال تمھارے دل میں بسیرا کر چکا ہے۔ میں اس خیال کو تمھارے دل سے دور کر دوں گی۔ تمھارے دل سے ان بے معنی باتوں کا نکال کر دم لوں گی۔ اور تمھیں زندگی کا حقیقی سبق سکھا دوں گی۔ اک گھراؤ مت۔!

مجھ سے نہ ڈرو۔ میں بھی انسان ہی ہوں۔ تمھاری طرح، میرے سینے میں بھی دل ہے۔ اس دل میں بھی محبت ہے۔ پیار ہے اور درد ہے۔ جو تمھاری پریشانی حالی پر رہ رہ کر اُٹھتا ہے۔ تھرّا اُٹھتا ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور ہمدردی ہے۔ مجھے تم سے عداوت نہیں۔ بیر نہیں، نہ دشمنی ہے۔ مجھے اپناؤ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔"

نزہت! رفیقہ کے یہ الفاظ سن کر بھی میں اسے نہ جان سکا۔ وہ میرے لئے برابر ناگن رہی۔

نزہت مجھ سے بڑھ کر تم میری حالت سے باخبر ہو۔ تمھیں بتاؤ کہ میں کیسے اپنے اوپر یہ جفا ہوتے ہوئے دیکھ سکوں گا۔ تمھی اس وقت اپنا دست اعانت دراز کردو۔ یا پھر اپنے خیال سے کہہ دو کہ مجھ سے الگ ہو جائے۔ میرے خیالات منتشر ہیں۔ سارے شریر میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ دل میں طوفان اُٹھ رہا ہے۔ مدقوق سینہ اور مفلوج ذہن لئے اب میری حالت ایک پاگل سے کم نہیں!!

آخر میں جگرؔ کا وہ شعر دہراؤں گا جو تم اکثر گنگنایا کرتی تھیں۔ ؎

ایک لفظ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اچھا اب اجازت۔ میں ہوں زندگی سے اکتایا ہوا۔

تمھارا۔ احمد

راکھ کا ڈھیر

"ذرا ہمت سے کام لو۔"

امتیاز نے راشدہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

راستہ بہت دور تک چلا گیا تھا ۔۔۔۔ کشادہ، صاف و شفاف، اور چمکتا ہوا فرش ـــ یہ راستہ ان کمروں کی طرف جا رہا تھا جو روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔

"اف! میں اس حالت میں اتنی دور نہیں چل سکتی۔" راشدہ نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

"میں اٹھا لوں تمھیں۔" امتیاز نرمی سے بولا۔

وہ شرما گئی۔

"توبہ! کیسی باتیں کرتے ہو۔ دیکھنے والے کیا خیال کریں گے!!"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

امتیاز نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بازوؤں پر اسے اٹھانا چاہا۔ لیکن راشدہ پرے ہٹ گئی۔

"اچھا نہ سہی۔ مگر کم از کم میرا سہارا تو لے لو"

یہ کہتے ہوئے امتیاز نے کندھوں کے گرد اپنا بازو ڈال کر راشدہ کو مضبوطی سے تھام لیا اور سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

راشدہ کے جسم میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں وہ چند قدم طے کرتی درد کی شدت سے تڑپ جاتی۔ سارے بدن پر ایک کپکپاہٹ سی طاری ہوتی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے تیرنے لگے۔

"اپنا سارا بوجھ مجھ پر ہی ڈال دو۔ تمہیں چلنے میں آسانی ہو جائے گی۔"
امتیاز نے آہستہ سے کہا۔"

بدلے میں راشدہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنا سر امتیاز کے کندھے پر ڈال دیا، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کمرہ تشخیص کے نزدیک پہونچ گئے۔

نرس راشدہ کو اندر لے گئی اور وہ باہر کھڑا انتظار کرنے لگا۔"
کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد امتیاز بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا ـــــ

یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا ـــــ ہاں اسے بالکل خیال نہ تھا کہ اس قدر جلدی کیسے ہو گیا ـــــ یہ تو وقت سے پہلے ہی تھا۔ راشدہ شام کو اچھی بھلی تھی۔ وہ حسب معمول تھکا ماندہ گھر لوٹا تھا ...
راشدہ دروازے پر بیٹھی تھی اور ایک دلفریب مسکراہٹ سے امتیاز کا استقبال کیا تھا۔ پھر حسب عادت پانی کا گھڑا لے آئی اور اس کے ہاتھ

پاؤں دھلوائے تھے۔ کتنی خدمت گزار تھی۔ وہ اس کے سینے میں تشکر اور محبت کے جذبات امڈ آئے ۔۔۔۔۔ اور وہ اکلوتی بچی فریدہ کے ہمراہ راشدہ کے اصرار پر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

ہمیشہ کی طرح وہی روکھا سوکھا کھانا۔

راشدہ اٹھی اور رسوئی گھر کی طرف گئی۔ شاید کچھ لانے کے لئے۔ مگر کچھ قدم چل کر وہ اچانک چکرا کر دہلیز پر بیٹھ گئی۔

امتیاز کھانا چھوڑ کے اس کی طرف بھاگا۔ اور نہایت بیقراری اور کرب سے پوچھا کہ یہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے ۔۔ مگر وہ ٹالتی رہی۔ اور انکار کرتی رہی کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح اپنی ہر تکلیف اس سے چھپاتی رہی تھی۔

وہ بار بار اپنا منہ گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی رہی تاکہ اس کی تکلیف۔۔ بھانپ کے امتیاز پریشان نہ ہو۔۔۔۔۔ آخر بار بار اصرار کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت بہت خراب لگ رہی ہے۔

یہ سنتے ہی امتیاز حیران رہ گیا۔ وہ فوراً تانگہ لا کر اسے ہسپتال لے آیا۔

"خدا کرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے"۔

امتیاز نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ اس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ کبھی وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگتا۔ پھر آکر بنچ پر بیٹھ جاتا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن کان اس کے دروازے پر لگے تھے

اتنے میں دروازہ کھلا۔

راشدہ کو اسٹیچر پر لٹایا گیا تھا۔۔۔ اور اسٹیچر اہل کار آپریشن تھیٹر کی جانب لے گئے۔ راشدہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے امتیاز کو دیکھ رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند کیا گیا۔ وفورِ غم میں ۔۔۔۔امتیاز راشدہ سے بات بھی نہ کر سکا۔ تھیٹر سے ملحق کمرہ میں بلا کر ایک فارم پر امتیاز کے دستخط کرائے گئے، تاکہ آپریشن کرانے سے متعلق کارروائی مکمل ہو سکے۔

غمزدہ اندوہ کی تصویر بنا امتیاز بنچ پر بیٹھ گیا۔ طرح طرح کے خیالات اس کا قرار لوٹنے لگے۔۔۔۔۔"

کتنی کمزور ہے وہ۔۔۔۔ کیا وہ زندگی اور موت کی اس کشمکش سے زندہ بچ جائے گی۔

امتیاز نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی۔ اس خدائے برتر کے حضور میں جو موت اور زندگی کا مالک ہے۔ اس نے معاً دروازہ سے کان لگا کر آواز سننا چاہی مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ صرف قدموں کی دھم چاپ کے ساتھ ساتھ اوزاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تھیٹر اسسٹنٹ نے امتیاز کو تسلی دی، اور وہ پھر سے بنچ پر بیٹھ گیا۔۔۔

اندر راشدہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس ناقابلِ برداشت تکلیف کو سہتی رہی اور پھر اسی پر بیہوشی طاری ہو گئی۔۔۔۔ پیٹ چاک کر کے باہر نکالا گیا اس نوزائیدہ

کے نحیف سینے میں رتی بھر جان باقی تھی جس بچوں کے لئے زندہ رہا۔ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

راشدہ کو اب کچھ کچھ ہوش آ رہا تھا۔ اس نے بچے کے متعلق کچھ نہ پوچھا جیسے اسی کی کسی چھپی ہوئی حس نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ نرس اسے تسلی دینے لگی۔

"بچہ مر چکا ہے"۔ آٹھویں مہینے میں جو بھی بچے پیدا ہوتے ہیں عموماً زندہ نہیں رہتے۔"

پھر نرس نے بچے کو اٹھا کر اسے دکھایا۔ راشدہ نے مری مری نظروں سے اسے دیکھا۔

زرد چہرہ.... نازک نقش...... سوکھا بے جان جسم۔ آگے وہ نہ دیکھ سکی۔ اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ آنکھوں سے خاموش آنسو نکلے محبت اور ممتا کی وہ گرم گرم دھارا جو نئے سرے سے امڈ کر اس کے سینے میں بہہ نکلی تھی سرد ہو کر منجمد ہو گئی۔

امتیاز کی بے قرار نظریں ابھی تک دروازے پر لگی ہوئی تھیں...

پھر دفعتاً دروازہ کھلا۔

نرس باہر آئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ نرس نے بتایا کہ بچہ مر چکا ہے۔ ساتھ ہی اسے تسلی بھی دینے لگی۔

مگر امتیاز کو بچے کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ اس ... میں ایک

بات سمائی ہوئی تھی۔ کاش راشدہ بچ گئی ہو۔ کاش وہ بچ جائے اس نے
پاگلوں کے انداز میں نرس سے پوچھا۔
وہ کیسی ہے؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر اندر گھسنے لگا تو نرس
نے غصّہ سے ڈانٹ کر کہا۔
"ارے.... ارے کہاں جا رہے ہو تم۔ ابھی اندر نہیں جا سکتے۔ جاؤ
پہلے جا کر اسی کے لئے قہوہ بنا کے لئے آؤ۔"
"کیا کہا۔ قہوہ! تو کیا وہ زندہ ہے؟ خداوندا لاکھ لاکھ شکر ہے۔
تمہارا۔"
اور جب وہ قہوہ لے کر آیا تو راشدہ کو وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ بستر
پر خاموش اور نڈھال پڑی تھی۔ اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر
امتیاز نے پوچھا۔
"اب کیسی طبیعت ہے؟"
"راشدہ کے خشک لبوں پر ایک کمزور پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی
اور آہستہ سے لب ہلے۔
"اچھی ہوں۔"
شفقت اور پیار سے وہ راشدہ کے کمزور جسم کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے
بچے کے بارے میں کچھ نہ کہا...... خیر جس کے لئے اس نے خدا سے دُعا
مانگی تھی وہ بچ گئی تھی۔ اس سے زیادہ اسے اور کچھ نہیں چاہئے تھا۔ قہوہ
کے کچھ گھونٹ اس کے حلق میں ڈال دیئے اور پھر راشدہ آنکھیں بند کئے

پڑتی رہی۔

یوں تو راشدہ میں کوئی جسمانی کشش نہ تھی۔ نوجوانی میں جو ذرا کشش اور حسن تھا۔ وہ غربت نے اس سے چھین لیا تھا۔ اس کا رنگ دیکھتے ہی دیکھتے وقت کے تھپیڑوں کی وجہ سے پھیکا پڑ گیا تھا...... آنکھیں اندر کو دھنس گیئں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔

ہردم اس کا سوکھا بوسیدہ جسم ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپا رہتا تھا۔ پچیس چھبیس سال کی عمر میں ہی راشدہ اڈھیر نظر آنے لگی تھی۔

اگلے روز امتیاز سات سالہ بچی فریدہ کو ساتھ میں لایا۔ راشدہ کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ فریدہ ماں کی سرھانے کھڑی ہوگئی۔ اور بڑی بیتابی سے سوال کرنے لگی۔

"امّی تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ اماں بتاؤ تو کیا ہو گیا ہے۔؟"

"ارے ہاں تمھاری امّی کو تو بخار ہے"۔

امتیاز نے راشدہ کی پیشانی چھوتے ہوئے کہہ دیا۔

"امّی اپنا ہاتھ مجھے دو۔ میں چوم لوں تو تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی"۔

اور پھر فریدہ ماں سے لپٹ گئی۔"

راشدہ کی آنکھیں بھر آیئں۔ سوچنے لگی کہ کتنا پیار کرتی ہے یہ معصوم مجھ سے...... آخر اس نے زندگی میں کون سا سکھ پایا ہے۔ سوائے غربت، بھوک اور مصیبت کے۔ لمحہ بھر کو بھی چین نصیب نہ ہوتا تھا"

بس بچی کی محبت اور شوہر کا پیار یہی تو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔

شام کو جب امتیاز دودھ اور ڈبل روٹی لے کر راشدہ کو دیکھنے آیا تو وہ نڈھال سی پڑی تھی۔ کل والی شگفتگی کی بالکل غائب تھی۔ چہرہ یکدم زرد اور کمزور پڑ گیا تھا۔ اتنا زرد کہ معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ امتیاز نے ذرا جھک کر آہستہ سے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"اف کتنا سرد ہے یہ ہاتھ" بے اختیار اس کے منھ سے نکل گیا۔ راشدہ نے تھکی ہوئی آنکھیں بہ مشکل کھولیں۔ ان آنکھوں میں ایک ویرانی تھی۔

اتنے میں لیڈی ڈاکٹر اور نرس ہال میں داخل ہوئیں۔ بیڈ نمبر چھ کے قریب آکر نرس نے راشدہ کے انگوٹھے سے کچھ قطرے خون کے نکالے۔ ..... خون کا معائنہ کرانے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے امتیاز کو اپنے کمرے میں بلایا۔

"جانتے ہو تمھاری بیوی کس خطرناک حالت میں ہے۔ اگر حمل کے دوران میں اسے دودھ، پھل، ٹانک اور لیور اکسٹریکٹ انجکشن دلوائے ہوتے تو آج اس حالت کو نہ پہنچتی۔ اور جب موت کے منھ میں پہنچ گئی تو اسے ہسپتال لے آئے ..... شاید اس کی موت کی ذمہ داری ہم پر ..."

"نہیں! نہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ۔ کچھ نہیں ہوگا"

امتیاز نے غیر ارادی طور پر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحبہ کا ایک ایک لفظ ہتھوڑے کی تیز ضرب بن کر اس کے

دل پر چڑھا ہوا تھا۔

ٹانک ..... انجکشن ..... دودھ ..... پھل۔ یہ سب ایک معمولی کلرک اپنی بیوی کے لئے کہاں سے مہیا کر سکتا ہے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کیا نہ کرتا ..... وہ موت کے منہ میں پڑی ہے۔ ادھ مرا سا۔

"ڈاکٹر صاحب کی نخوت کاری کو نظر انداز کر کے اشتیاق نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔"

"جس طرح بھی ہو سکے۔ آپ میری بیوی کو بچا لیجئے۔ میں ہر طرح کا خرچ برداشت کروں گا۔"

اور پھر اشتیاق نے کچھ ادویات وانجکشن حسب ہدایت بازار سے خریدنے کے لئے ایک دوست سے قرض لیا۔ دفتر بس میں جانا ترک کیا۔ سگریٹ پینا اور اخبار پڑھنا چھوڑ دیا۔ اپنی چند سکوں سے وہ راشدہ کے لئے پھل خرید کر لاتا۔ ہسپتال میں علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔

اس کے باوجود راشدہ برابر اداس سی پڑی رہتی۔ مضمحل و مایوس چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا گیا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اس قدر سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم رکھنے کے لئے ربڑ کے دستانے چڑھائے جاتے اور گرم پانی کی تھیلیاں ان کے نیچے رکھی جاتیں۔

راشدہ کے چہرہ پر مانو موت کی سی سفیدی چھا گئی تھی۔

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ ہاں۔ بالکل سچ۔ تم ضرور اچھی ہو جاؤ گی۔"

امتیاز اسے تسلّی دینے کی کوشش کرتا۔ بدلے میں ایک پھیکی اور اُداس سی مسکراہٹ راشدہ کے سوکھے لبوں پر ابھر آئی۔

"ہاں میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

اور آخر وہ رات بھی آگئی جو راشدہ اور امتیاز کے لئے قیامت سے کم ثابت نہ ہوئی۔ راشدہ اب تک ہر تکلیف کو خاموشی اور صبر سے برداشت کر رہی تھی...... اور نہ سہہ سکی ــــ بے بسی سے گھبرانے لگی۔ وہ اس بے بسی اور کرب کے ساتھ کراہ رہی تھی کہ امتیاز جان گیا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ ــــ اس نے آج رات وہیں پر رہنے کے لئے نرس سے بہت منت سماجت کی۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

"یہ ہسپتال کے قانون کے بالکل خلاف ہے۔ تم نے اپنی بیوی کے لئے اسپیشل کمرہ تھوڑے لے رکھا ہے۔ جو تم رات بھر اس کے پاس رہ سکو۔"

امتیاز مجبوراً راشدہ کو اسی کے حال پر چھوڑ کر واپس لوٹنے لگا۔ راشدہ زور زور سے کراہتی اور تڑپتی رہی۔ جیسے بغیر پانی کے مچھلی تڑپتی ہے۔ دوسرے وارڈ کی ایک نرس نے آکر اسے ڈانٹا۔

"تمھیں ذرا بھی احساس نہیں کہ دوسرے مریضوں کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ خواہ مخواہ کیوں اتنا چلّاتی ہو۔"

بے بسی کے عالم میں امتیاز یہ ماجرا دیکھ کر مرے مرے قدموں کے ساتھ ہسپتال سے باہر آگیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے کچھ بھی سوجھائی نہ دیا۔ راشدہ کی آواز کانوں کے پردے سے ٹکرا رہی

تھی ۔ فریدہ بیٹی کو تسلّی دے کر خود رات بھر جاگتا رہا۔

صبح سویرے اس نے ہسپتال کا رخ کیا۔ فریدہ کو ہمسایہ میں رہائش پذیر درگا مائی کے پاس رکھا۔

راشدہ خاموش اور پرسکون پڑی تھی۔ جیسے اب اس میں کراہنے کی سکت نہ رہی ہو۔ یا اب اسے آرام ہو ۔۔۔۔۔۔ امتیاز سوچنے لگا نہ اب راشدہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کرخت لہجے میں کہا۔

"اب تو صرف ایک ہی راستہ باقی ہے۔"

"وہ کیا ڈاکٹر؟" امتیاز نے پوچھا۔

"یہ کہ اس کے جسم میں خون داخل کیا جائے گا۔"

امتیاز فوراً ہی اپنا خون دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کے خون کا ٹسیٹ کیا گیا۔ پاس ہی کھڑے ڈاکٹر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کمزور اور سوکھا سا انسان۔ اس کے جسم میں کتنا خون ہو گا۔ جو وہ اپنی بیوی کو جس کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ خون دے سکے گا۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔ اگر میرا خون اسے زندہ رکھ سکتا ہے تو میں اپنا سارا خون دینے کے لئے تیار ہوں۔"

امتیاز بے تامل کہہ گیا۔

الغرض امتیاز کے جسم سے گرم گرم خون نکالا گیا۔ اس خون کی ایک ایک بوند میں محبت کی گرمی تھی۔ خون راشدہ کے جسم میں داخل کیا گیا۔

یکدم اس کی سکڑی ہوئی رگوں میں گرمی کی لہر دوڑنے لگی۔ لبوں پر دلکش مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ امتیاز یہ تبدیلی بھانپ کے خوش ہونے لگا۔ کہ آخر اس کا خون دینا رائیگاں نہیں گیا۔

دفعتاً راشدہ نے آنکھیں کھولیں۔ پیار سے امتیاز کی طرف دیکھا پھر خفیف آواز میں کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کچھ کہنے کے لئے اس نے ہونٹوں کو حرکت دی۔ لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

امتیاز اس پر جھک گیا۔ فقط ہونٹ پھڑ پھڑاتے رہے۔ انتہائی یاس کے عالم میں وہ ادھر اُدھر کھوجنے لگی۔ شاید وہ فریدہ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ سوچتے ہی امتیاز تیزی کے ساتھ گھر کی جانب بھاگا اور فریدہ کو لے آیا۔

راشدہ نے حسرت بھری نگاہوں سے فریدہ کو دیکھا اور پھر پیار کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ مگر کمزوری کی وجہ سے ہاتھ بستر پہ گر پڑا۔۔۔۔ اسی حالت میں کچھ وقت گزرا۔۔۔۔۔۔ پھر اس نے امتیاز پہ نظر ڈالی۔۔۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے رخصت طلب کی۔۔۔۔ اور خدا حافظ۔

راشدہ سدا کے لئے اس دنیا سے چلی گئی۔ بہت دور۔۔۔ ایک زندگی ختم ہو گئی۔۔۔۔۔

امتیاز کا سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ ہسپتال ہے۔ گھر نہیں ہے۔ اسے ضبط سے کام لینا چاہئے۔ وہ ہاتھ سے چہرہ کو ڈھانپ کر اٹھا۔ فریدہ باپ کی پاس کھڑی

پٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ موت کا راز اس معصوم کی سمجھ سے باہر تھا۔

نرس نے راشدہ کے بے جان جسم کو سیدھا کیا اور رنگین کمبل ہٹا کر اس پر سفید چادر اوڑھا دی۔

سفید چادر اور اتنا ہی سفید چہرہ .... اس کے گرد بکھرے ہوئے کالے بال۔

سکتے کے عالم میں کھڑا امتیاز شریک حیات کو گھورتا رہا۔ اس کے تمام حواس شل ہو چکے تھے۔ پھر اس کے کانوں میں دھیمی دھیمی آواز آنے لگی۔

"اب تو رات کافی گزر چکی ہے۔ نعش تمھیں صبح ہی ملے گی۔ ہم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے۔ باقی ہمیں تمھاری بیوی کے مر جانے کا بہت افسوس ہے۔" لیڈی ڈاکٹر یہ کہہ کر نرس سے مخاطب ہوئی۔

"خاکروبوں سے کہو کہ لاش کو اٹھا کر مردہ خانے میں ڈال آئیں۔"

کچھ دیر بعد دو خاکروب حاضر ہوئے پر انھوں نے ایک زبان ہو کر اعلان کیا کہ جب تک انھیں پیسے نہ دیئے جائیں وہ لاش نہیں اٹھائیں گے۔

یہ منظر دیکھ کے امتیاز بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا وہ اس سے زیادہ لاش کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ اور اپنی تمام تر قوت کو یکجا کر کے اس نے راشدہ کے مردہ جسم کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا۔ نرس نے اسٹیچر آگے بڑھایا تو امتیاز تلخی سے چلّایا

"ہٹ جاؤ سامنے سے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مجھے۔"

اور پھر حیرت زدہ مختصر مجمع چیرتا ہوا امتیاز ہسپتال کے ماحول سے باہر نکل آیا۔ کسی ایک نے بھی مداخلت نہ کی۔ فریدہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اور باپ کے کوٹ کا کنارہ پکڑے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

جان سے عزیز راشدہ کے بے حس جسم کو کفنانے اور دفنانے سے فراغت پا کے امتیاز اپنے آپ سے بے نیاز سکتے کے عالم میں کھڑا دور خلاؤں میں بے مطلب کچھ کھوج رہا تھا کہ دفعتاً فریدہ بیٹی نے اس کے دامن کو جھنجھوڑا۔

"ابو! میری امی کہاں گئی۔ امی کو بلاؤ ابو! میں اب اسے تنگ نہیں کروں گی۔ میں ٹافی بھی نہیں مانگوں گی۔ ابو ۔ ۔ ۔ ۔"

امتیاز کی سوچوں کی دنیا سمٹ گئی۔ اس نے فریدہ کو سینے سے لگایا۔ "بیٹی تمہاری امی اب واپس نہیں آ سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہم سے ناراض ہو کر چلی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ بہت دور ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنا کہکے امتیاز فرطِ غم میں بلک بلک کر رونے لگا۔ اپنی برگشتہ بختی پہ ماتم کرنے لگا۔ اب اس کے پاس کیا تھا۔ صرف ایک راکھ کا ڈھیر جس کو کریدنے سے کچھ ملنے والا نہ تھا ـــــ یہ راکھ اسے کبھی زندگی کی آگ کی یاد دلاتی اور کبھی اپنی مجبوریوں کی ؛ ـــــ ؛

ـــــ ؛ ـــــ

اپنا پرایا

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ آن کی آن میں آسمان پر بادل چھانے لگے۔ اور بجلی کی کڑک نے رات کو اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ آندھی اور طوفان میں مقید رات...... ہر طرف سناٹا..... وحشت ناک خاموشی چھانے لگی ـــــ

الغرض رات ایک نئی نویلی بیوہ کی طرح سیاہ لبادہ اوڑھے اور بال کھولے کراہ رہی تھی۔

سلمہ بھی بیوہ تھی۔ اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ آج لگاتار سلمہ کئی دنوں سے بستر مرگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ بھی کراہ رہی تھی ـــ اس میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ اور ایک اکیلا سہارا امجد اس کی گود سے چپیال سو رہا تھا۔ زبردست آندھی کے شور نے امجد کی نیند اچاٹ کر دی ـــ وہ مارے خوف کے چیخ اٹھا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

"ماں!" بدلے میں سلمہ نے اس کے بدن پر ہاتھ پھیرا اور امجد

سہمے ہوئے بچے کی طرح خاموش ہو گیا۔ کوٹھری میں ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما رہا تھا......

ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کے لئے سلمہ بقصد مشکل چارپائی سے اٹھی...... آہستہ آہستہ کھڑکی تک پہونچی اور کواڑوں کو بند کیا...... واپس ہوئی تو کسی چیز سے ٹھوکر کھا کے فرش پر ایسے گری کہ پھر اٹھ نہ سکی...... ہوا کے ایک تیز جھونکے نے کھڑکی کے پٹ سے کھول دیئے۔ اور ٹمٹماتا چراغ بجھ گیا...... سلمہ ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ اور امجد کو بے آسرا کر گئی۔

امجد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپیڑ مار کر جگایا ہو......

"ماں! تم کہاں ہو۔ ماں!" امجد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اتنے میں بجلی اس انداز سے چمکی کہ اس کی روشنی میں امجد کی نظر ماں پر پڑی۔ جو اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی...... بے حرکت اس نے ماں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتے ہوئے کہا۔

"اٹھو ماں! مجھے ڈر لگتا ہے۔ اٹھتی کیوں نہیں ہو ماں۔ تمہیں امجد پکار رہا ہے۔ تمہارا بیٹا۔ ماں کیا مجھ سے روٹھ گئی ہو۔ ماں پیارا اٹھو! میں اب دودھ نہیں مانگوں گا۔ میں اب تنگ نہیں کروں گا۔ کھلونے بھی نہیں مانگوں گا۔ مگر تم اٹھو تو ماں......"

امجد کہتا رہا۔ بجلی کڑکتی رہی۔ ماں برابر خاموش تھی...... اور

دنیا کے رکھوالے حسب عادت یہ تماشا دیکھنے میں محو تھے۔

اگلے روز امجد کو اس کے چچا اپنے گھر لے گئے۔ رشید میاں کا گھر جو مقامی ابریشم کارخانہ میں دو صد روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی اچھے انداز سے کٹ رہی تھی۔ رشید میاں کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ جس کا اسے اور اس کی بیگم عابدہ کو کافی دکھ تھا۔ آستانوں پہ ناک رگڑنے، خانقاہوں پہ نیاز چڑھانے اور محتاجوں میں خیرات بانٹنے پر بھی عابدہ کی مراد بھر نہ آئی۔۔۔۔۔ عابدہ چھوڑ رشید میاں نے بھی اولاد کی کمی کو کئی بار شدت سے محسوس کیا لیکن اس کمی کو پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"جانے اولاد کی صورت دیکھنا نصیب کبھی ہوگی یا نہیں۔ کیوں نہ امجد کو ہی اولاد کا درجہ دیدیا جائے"۔

اسی خیال کے پیش نظر رشید میاں امجد کو اپنے گھر لایا تھا۔ امجد کو اس نئے گھر میں ہر طرح کا سکھ اور آرام ملا۔۔۔۔۔ اور اس آسائش و راحت سے امجد اپنی ماں کو کسی حد تک فراموش کر بیٹھا۔۔۔۔ پیار و انسیت کے عالم میں غرق امجد نے تعلیم و تادیب کے لق و دق صحرا کو درجہ بدرجہ پھاندنا شروع کیا۔۔۔۔ کئی بہاریں آئیں اور چلی گئیں۔۔۔۔ امجد زندگی کا سفر طے کرتا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں اپنے چاچا، چاچی کے لئے محبت و احترام کی شمعیں روشن ہو گئیں۔۔۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کے کسی کام آسکوں یا ان کی خدمت کر سکوں۔

لیکن فاعل حقیقی کو امجد کی یہ خوشی اور یہ مسرت ایک آنکھ نہ بھائی۔ برسوں کے بعد جبکہ عابدہ امجد کو اولاد کا درجہ بخشنے کہ اب خود ماں بننے کی خواہش کو زیر زمین دفن کر گئی تھی۔ اس کردگار نے اپنے فیض و کرم کا جھروکا وسیع کر دیا...

عابدہ امید سے ہوئیں.....

ایک چاند سا بیٹا عابدہ کو خدائے برحق نے عطا کیا۔ اسی خوشی کو دوچند کرنے کے لیے رشید میاں نے بڑے پیمانے پر یار احباب کی دعوت کا اہتمام کر دیا۔ کوٹھی کا وسطی ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا...... قہقہوں اور پُرمسرت خوش گپیوں سے سارا ہال گونج رہا تھا۔ اسی خوشی کے عالم میں امجد کبھی ادھر بھاگتا کبھی اُدھر۔ برابر میزبان کی حیثیت سے ہر ایک سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آیا..... دراصل وہ بھی بہت خوش تھا۔ کیونکہ مدتوں بعد اسے بھائی ملا تھا...... چھوٹا بھائی..... مہمانوں سے نپٹے امجد نے خوشی و انبساط میں سرشار بچے کو پیار کرنے کی غرض سے گود میں اٹھالیا۔

"ارے بگاڑ دے گا میرے ننھے کو۔"

عابدہ نے حقارت آمیز لہجہ میں بچے کو امجد کی گود سے کھینچ لیا کہ امجد کے قدم اسی جگہ جم کر رہ گئے۔ جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔

موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

کافی رات گئے تک اڑوس پڑوس کی عورتیں ڈھولک پر خوشی کے گیت گاتی رہیں...... ایسا محسوس پڑتا تھا کہ عابدہ کو اور رشید میاں کو مانو قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو [illegible] خوشی و مسرت کا اظہار

کیا جا رہا تھا۔ امجد ان لوازمات سے بے خبر چھوٹے دلان کے گوشہ راست میں بیٹھے اپنے آنے والے کل کی بابت سوچ رہا تھا...... اپنے مستقبل کی نسبت۔

صبح صادق مولوی تمیز الدین مسجد شریف سے بچے کا نام رکھنے والی رسم میں شرکت کرنے کے لئے بلائے گئے۔ اور بچے کا نام انور رکھا گیا۔

انور چونکہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا..... خوب ناز و ادا میں اس کی پرورش کی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ کا پیار انور کے لئے بڑھ گیا۔ اور امجد کے ساتھ ناروا سلوک اپنایا گیا...... صدائے احتجاج بلند کرنے یا واویلا سے کام لینے کے بجائے امجد نے چپ سادھ کر حالات کا جائزہ لینا اپنا فرض جان لیا۔ خاموش رہ کر اس نے ہر سختی کو برداشت کیا..... اور کبھی اپنی چاچی کے ساتھ بے مطلب مخاطب نہ ہوا...... لیکن اندر ہی اندر وہ گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس حقیقت کا احساس ڈسنے لگا کہ اب اس کی حالت ایک کٹی پتنگ سے کم نہیں ہے۔ جس کی ڈور ٹوٹ گئی ہو اور تار تار ہونے کے لئے تند و تیز ہوا کے حلقے میں مقید پڑی ہو۔

ادھر امجد ایک قدم قدم پھونک کر اٹھانے لگا۔ اور دوسری جانب چاچی ہٹ کر بیٹھی تھی کہ امجد اور اس کے چچا کے درمیان نفرت و دشمنی کی دیوار اٹھائی جائے۔ رشید میاں گھر میں قدم رکھتے تو امجد کی نسبت نہ جانے کیا کچھ سننا پڑتا تھا۔ پہلے پہل تو رشید میاں نے اس اناپ شناپ پر کان نہیں دھرے مگر لحظہ بہ لحظہ اس کے دل میں بھی بدگمانی نے گھر کر لیا۔

آج جب رشید میاں دو دنوں کی غیر حاضری کے بعد گھر لوٹے تو گھر میں

قدم رکھتے ہی عابدہ نے ایک اور تیر پھینکا:

"اب اس گھر میں امجد رہے گا یا میں"

"ایسی کون سی بات ہو گئی عابدہ"۔ رشید نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں" عابدہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔ "یہ کل ہی کی بات ہے امجد نے مجھ سے پانچ روپے مانگے ۔ میری جیب اس وقت خالی تھی۔ میں نے انکار کیا تو میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور طرح طرح کی صلواتیں سناتے ہوئے کہا ...... دیتی ہو روپے یا میں گردن دبوچ لوں ...... یہ کہہ کے اس نے میری گردن پر ہاتھ رکھ دیئے ۔ بھلا ہو فیض کے باپ کا اور بیٹے انور کا کہ ان کے وقت پہ آجانے سے میری جان بچ گئی ...... جب سے گھر چھوڑ چلا گیا ہے .... سنا ہے اب جوا بھی کھیلنے لگا ہے"۔

عابدہ امجد کی نسبت شکایات کا پلندہ کھولے رشید کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ جو عتاب و غیض کے ملے جلے اثرات سے بھر گیا تھا ..... اسی دوران امجد اندر داخل ہوا ..... فلمی گیت گنگناتا ہوا۔

"بھگوان دو گھڑی ذرا انسان بن کے دیکھ ۔

دھرتی پہ چار ...."

"کہاں تھے اس وقت تک بھگوان کے بچے؟" رشید میاں تو غصے سے ابل پڑے۔

امجد اس غیر متوقع صورت حال کے پیش نظر سہم سا گیا ۔ جیسے اس پر ہمالیہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو ۔ اتنا جاننے میں اسے دیر نہیں لگی۔ کہ چاچی صاحبہ نے حسب عادت

کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑا ہے۔ آل قول سے کام لیا ہے۔ جب سے انور اس گھر میں آیا ہے۔ چاچی کے عادات ہی بدل گئے ہیں ۔۔۔ وہ خاموشی سے فرمانبردار طفل کی طرح کھڑا رہا۔

"میں پوچھتا ہوں کہ تم اس وقت تک کہاں تھے؟" جواب نہ پاکر رشید میاں غصے میں آکر چلائے۔

"اب تیری یہ ہمت کہ جب میں گھر سے غیر حاضر رہوں تم اودھم مچا ور طوفان بپا کر دیتے ہو ۔۔۔ کبھی انور کو چھیڑتے ہو تو کبھی چاچی ۔۔۔ جھگڑتے ہو کمینے عابدہ نے تمھیں ماں کی طرح پالا پوسا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اس کا بدلہ دے رہے ہو۔ یہ تیرے باپ کا گھر ہے۔ جو تم اسے میدان جنگ بنانے کی کوشش میں ہو۔"

امجد اب بھی خاموش تھا ۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کوئی بات معاملہ خراب کر دے۔ اس کی خاموشی کو اقبال جرم سمجھ کر رشید میاں اور طیش میں آئے اور اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"ارے بے شرم چپ کیوں ہو۔ بولتا کیوں نہیں!" اب کی امجد نے بمشکل زبان کھول دی۔

"چاچا جی! یہ سب جھوٹ ہے۔"

"کمینے تو جو کہے وہ سچ ۔۔۔ اور جو تمھاری چاچی کہیں وہ لغو اور بکواس۔ اس نے ماں کی طرح تمھیں پالا ہے۔ اس پر الزام لگاتے شرم نہیں آتی ہے۔ بے غیرت کہیں کے دفع ہو جاؤ میری نظروں سے" چچا ابا کا غصے سے لال پیلا

ہوتے دیکھ کر امجد سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماحول میں انارکی کا رنگ جم جائے۔۔!"

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ اس کی توجہ اس پر آشوب ماحول میں علی الاعلان تعلیم سے ہٹنے لگی اور جب بی۔اے کا نتیجہ نکلا تو کامیابی اسے حاصل نہ ہوئی۔"

عابدہ نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور رشید میاں سے مخاطب

"اجی ایسے آوارہ لڑکے کبھی کہیں پاس ہوتے ہیں۔ جو دن بھر کالج سے غائب ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں اور شام کو بغل میں کتابیں دبائے گھر آجاتے ہیں۔"

اس بار عابدہ کا تیر خالی نہیں گیا۔ رشید عابدہ کی تائید کرتے ہوئے بے رخی کے ساتھ امجد پر برس پڑا۔

تیرے ماں باپ میرے پاس کوئی تجوری نہیں چھوڑ گئے ہیں۔ جو تم رقم اڑاتے پھرو۔۔۔ اور پھر میں نے تمھاری ساری زندگی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے کہ تمھارے ناز نخرے برداشت کرتا رہوں۔۔۔ تم اپنی من مانی کرتے رہو۔ اب یہاں تمھاری من مانی نہیں چلے گی۔ غور۔۔ سن لو۔ اس گھر میں رہنا ہو تو ہماری مرضی کے مطابق رہنا پڑے گا۔"

آج تک امجد نے چاچی کے ظلم و ستم سہہ لئے تھے وہ بھی خاموش رہ کر۔ مگر اب چاچا کی زبان سے یہ ترش و کرخت الفاظ سن کر اس آنکھوں سے آنسو

بہہ نکلے۔ کمرے میں گھس کر وہ چارپائی پر اوندھے منھ گر پڑا۔ اپنی بدبختی پر زار زار رونے لگا۔ گھناؤنے مستقبل کا گھناؤنا نقشہ آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا.......

امجد افراتفری کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی دوران والدین اور خاص کر ماں کی یاد ستانے لگی ...... وہ چیخا۔

"ماں۔ مجھے اس بے درد دنیا سے لے چلو۔ آخر میں نے کون سا جرم کیا تھا۔ مجھے جو اس بے وفا سنسار میں ٹھوکریں کھانے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا...... گردشِ دوران کا مقابلہ کرنے کے لئے"

ماں! کیا تمہیں بھی میری بیکسی پر رحم نہیں آتا۔ مجھے اس دنیا سے اٹھا لو۔ جہاں قدم قدم پر خود غرضی اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہے" —— امجد سسکیاں بھر رہا تھا۔

اور دوسرے کمرے میں رشید میاں اور عابدہ انور کے مستقبل کو درخشاں بنانے کی بابت سوچ رہے تھے۔ بازو والے کمرہ میں انور بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔ رات صبح کے انتظار میں بوڑھی ہوتی گئی......

اور صبح صادق انور دوڑتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اس کی طرف ایک کاغذ کا داغدار ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو ماں! بھیا کی چھٹی...... یہ بھیا اپنے بستر پر رکھ گئے تھے۔ اور نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔"

عابدہ نے چھٹی لے کر رشید میاں کو دیدی۔ اور انور کو خاموش رہنے کا

اشارہ کر دیا۔ رشید نے چھٹی پڑھی۔ لکھا تھا۔

چاچا جی

"میرا وجود چونکہ آپ کے لئے اب بوجھ کا روپ دھار گیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میری وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہوں ...... آپ لوگوں کے لئے اب مزید بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ اس لئے ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ کہاں۔ یہ بھی نہیں جانتا۔

آپ کا امجد

"یہ سب تیری وجہ سے ہوا عابدہ"۔ رشید نے کہا۔ اور عابدہ اپنے کئے پر پچھتانے کے بجائے برجستہ کہہ گئی۔

"جانے والا تو چلا گیا۔۔۔ اب بے کار جھگڑنے سے کیا حاصل"۔ اور رشید سر پیٹ کے رہ گیا۔

ادھر امجد دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے کو چیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف ......۔ اس کی حالت ایک پر کٹے پرندے سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کی حسرتوں اور امیدوں کا خون ہوا تھا۔ اور ان مردہ حسرتوں و امیدوں کی لاش کاندھے پر اٹھائے اس نے بڑی ندی کا رخ کیا اس خیال کو دل میں لئے کہ دریا میں کود دے۔ اس دھرتی کو اپنے غلیظ بوجھ سے ہلکا کر سکے ...... سرِ شام اپنے حال میں مست پل پر پہنچتے ہی اس کے کانوں میں آواز پڑی ...

وہ ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ دوسرے لمحے اس کے قدم اٹھے کہ "ہالٹ" کی آواز پھر آئی ....

امجد نے اپنے کان لفظ "ہالٹ" کی جانب لگادئیے۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ دفعتاً پل کے وسط میں ایک شور بلند ہوا ...... بندوق کی گولیاں "شائیں"۔ شائیں کرتی گزرنے لگیں۔ امجد دم بخود رہ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھا۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا ...... مشکل سے دو قدم بڑھا تھا کہ "ہالٹ" کی آواز کے ساتھ ہی ایک گولی امجد کے بغل میں لگی۔ اور وہ وہیں گر پڑا۔

دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر چھپ گئی کہ ملک کی تخریب کار جماعت کی جانب سے بڑی ندی کا لال پل اڑادینے کی سازش ناکام بنادی گئی۔ چار سازشی موقع پر مارے گئے اور تین کو زخمی حالت میں گرفتار کرلیا گیا۔ وہ ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔

امجد نے ہوش سنبھالا تو بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً نرس چلائی۔

"اٹھئے مت۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے"۔

یہ کہتے ہوئے نرس نے اس کے ماتھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔ امجد نے نازک انگلیوں کا لمس محسوس کیا اور غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ نرس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمھارا نام کیا ہے" ــــ "سلیمہ"۔ نرس نے کہا۔

"کیا کہا سلیمہ! بہت اچھا نام ہے۔ بالکل تمھاری طرح"۔

سلیمہ دراصل محکمہ سراغ رسانی سے وابستہ تھی۔ اور ڈاکٹری اسپتال میں

نرس کے فرائض ادا کر رہی تھی۔ اصلیت جاننے کی غرض سے وہ امجد کے ساتھ گھل مل گئی ۔۔۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہی تھی ۔۔۔۔ وہ ایک بار مسکرا دی اور آہستہ سے پوچھا۔ آپ کا نام؟"

"جی! میرا نام مر چکا ہے"۔

"نام مر چکا ہے۔ کیا معنے"۔ سلیمہ کچھ جاننے کی ٹوہ میں کہہ گئی ۔۔ "ہاں سلیمہ میرا نام مر چکا ہے۔ میں خود ایک زندہ لاش سے کم نہیں .... ویسے مجھے امجد کہتے ہیں"۔

"نام اچھا ہے مگر کام تو تباہی اور بربادی سے بھرپور ....."

"کیسی باتیں کرتی ہو سلیمہ" امجد بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"آپ رات کے اندھیرے میں پل اڑانے گئے تھے ۔" آخر سلیمہ نے مطلب کی بات چھیڑ دی"۔

"میں پل اڑانے گیا تھا" امجد حیرانی کا مجسمہ بن کر کہنے لگا۔

"ہاں! آپ بھی گئے تھے۔ پولیس رپورٹ میں درج یہی کچھ ہے۔ دیش کی بربادی و تباہی سے آپ کو کیا حاصل ہوگا"۔

"لیکن سلیمہ یقین کرلو! میں پل اڑانے نہیں گیا تھا" امجد نے تردید میں کہا"۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کا پل اڑانے گیا تھا" ہاں! اپنے جیون کا پل ...... یہ ایک لمبی داستان ہے"۔

"مجھے نہیں سناؤ گے اپنی کہانی" سلیمہ اصلیت جاننے کی چاہ میں کہہ گئی۔

"بلا وجہ گزرے دنوں کی یاد تازہ ہو جائے گی ۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو ..... امجد بے تامل کہہ گیا ۔

سلیمہ! میری داستان غم واندوہ کی زندہ تصویر ہے"۔

بدلے میں سلیمہ نے اصرار اس انداز سے کیا کہ امجد انکار نہ کر سکا ۔ اور اپنی گزری کہانی دھرانے لگا ۔

امجد اپنی کتاب زیست کا ایک ایک ورق الٹتا گیا اور سلیمہ سنتے سنتے اچانک چیخ اٹھی ۔

"بس کرو امجد! بہت دکھ اٹھائے ہیں آپ نے ۔ مجھ سے اور نہیں سُنا جاتا ۔

امجد خاموش ہو گیا"۔

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ خودکشی کی بابت سوچا جائے پریشانیوں سے تنگ آکر فراریت کا راستہ اختیار کرنا تو بزدلوں کا کام ہے"۔ سلیمہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا"۔

اب یہ دونوں ایک دوسرے کو الفت بھری نظروں سے گھورنے لگے"۔

امجد کی تیمارداری میں سلیمہ نے دن رات ایک کئے ۔ اس کی محبت و محنت نے امجد کو سرعت کے ساتھ تندرست کر دیا ۔ حکومت کے اہل کاروں نے امجد کی نسبت اصلیت جان کے اسے رہا کر دیا ۔ لیکن سلیمہ کے جنگل سے اسے آزادی ملی ۔۔۔ اسے چھٹی ملنے پر اسے اپنے گاؤں میں

ے گئی۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہائش رکھتی تھی۔ دونوں خوش تھے۔ امجد گزشتہ واقعات سے قطع تعلق محبت کی چھوٹی سی دنیا کو آباد کرنے کی بابت سوچنے لگا۔

ماں کا آشیرواد پانے کے بعد دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اور خوشی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

سلیمہ کی کوششوں کی بدولت امجد ایک سال کا کورس مکمل کر کے اسٹیٹ ہسپتال میں ملازمت کرنے لگا۔۔۔۔۔ امجد کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔۔ وہ ماضی کے تلخ و ترش لمحات کو اب مکمل طور سے فراموش کر گیا تھا۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔۔۔۔۔۔ اس کی پھلواری میں یکے بعد دیگرے دو کلیاں پھوٹ پڑیں۔۔۔۔۔ اسے شریک حیات، ایک ماں اور بچوں کی رفاقت کیا حاصل ہوئی کہ مانو دنیا کی تمام تر خوشیاں ہاتھ آگئی ہوں۔

ایک روز ڈیوٹی سے فارغ ہو کے امجد بلڈ بینک سے وابستہ کمرہ بند کرنے کو تھا کہ آواز نے کانوں کے پردے ہلا دیئے۔

"مجھ دکھیاری پر رحم کھائیے بابو! اگر خون نہیں ملے گا تو میرا اکلوتا بیٹا مجھے سدا کے لئے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ کسی نہ کسی طرح خون فراہم کیجئے۔"

"ماں!" امجد سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے ہمکلام اپنی چاچی کو پہچان لیا تھا۔"

عابدہ نے اپنی کمزور آنکھوں کو اوپر اٹھایا اور امجد سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بیٹا! انور تمھارا بھائی مرنے کو ہے اسے خون کی ضرورت ہے۔ مجھ ابھاگن پر رحم کھاؤ۔"

امجد نے چاچی کے ہاتھ سے ٹکڑا لے لیا...... اوہ! انور کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے...... خون کا گروپ دیکھ کے اسے مایوسی ہوگئی۔ کیونکہ اس گروپ کا خون سردست دستیاب نہ تھا۔ امجد نے چاچی کو انور کے بیڈ کے پاس بٹھایا۔ اور خود ڈاکٹر رحمان کے پاس چلا گیا۔ اپنے خون کا ٹسٹ کرایا........ اطمینان ہوا۔ جب گروپ مل گیا ـــــ اور اپنی رگوں میں سے خون نچوڑ نچوڑ کر انور کی بے دم نیم مردہ نسوں کی نذر کر دیا...... امجد آج کتنا خوش تھا کہ کم از کم پروردگار نے اسے احسانوں کا بدلہ چکانے کا موقع بخشا۔

امجد کی قربانی رنگ لائی۔ اور اس کے خون کا عطیہ دینے سے ایک قیمتی جان بچ گئی...... انور اچھا ہو گیا۔ انور نے اس کی تیمارداری سلیمہ سمیت دل و جان سے کی اور وہ وقت بھی آیا جب انور تندرست ہو کے ہسپتال چھوڑ رہا تو وہ اپنے بھائی کے پاؤں میں ڈھیر ہو گیا۔ بچوں کی طرح رونے لگا۔

"بھیا!" ہمیں معاف کر دو ـــ ہم نے آپ کو بہت دکھ دیئے۔ آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا ـــ اس سب کا معاوضہ آپ نے کس ادا سے دیا۔ میں زندگی بھر فراموش نہ کروں گا۔

"ارے پگلے! میں نے تو اپنا فرض ادا کیا۔" امجد برجستہ کہہ گیا۔ اور نور کو قدموں سے اٹھا کے گلے سے لگا لیا ـــ دونوں فرطِ مسرت میں رونے

لگے۔ عابدہ سامنے کھڑی تھی۔۔۔ اپنے کئے پر نادم اور شرمسار ۔۔۔۔۔
اس سے نہ رہا گیا۔ اور اپنا ئیت میں شرمسار امجد کو گلے سے لگا لیا۔۔۔۔
"بیٹے! ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔۔۔ ویسے تم معاف کر بھی دو میں
جانتی ہوں اللہ پاک مجھے معاف نہیں کریں گے! میں نے تم پر کتنے ظلم
ڈھائے۔۔۔۔۔ بیٹے تمہارے ساتھ ساتھ مجھے نصیبوں جلی نے تمہارے
چاچا اور اپنے سہاگ پر بھی جفا کی ۔۔۔۔۔ وہ تنگ آکر اس دنیا سے سدا کے
لئے منہ موڑ کر چلے گئے ۔۔۔۔۔ کاش مجھے موت آجاتی ۔۔۔۔ کاش ۔۔۔۔"
"ماں! دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ قسمت کے لکھے کو
کون مٹا سکتا ہے۔۔"
امجد کے بجائے سلیمہ نے عابدہ کو تسلّی دی اور پھر سب کے سب
ہسپتال سے نکل کر ایک نئی منزل کی تلاش میں چل پڑے۔ نئی منزل ۔۔
جس میں اپنا ئیت انسیت و اخوت مضمر ہو! اور اپنے پرائے میں تمیز نہ کی
جاتی ہو ۔۔!

مثلث

از جبل پور

پیاری روشن۔ پیار بھرا اسلام قبول ہو!

واہ گھوم پھر کے پھر سے اسی جگہ پر آپہونچی ہو۔ جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ یہ کیا دل لگی ہے۔ ارے بگلی کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹنے سے مشکلات کا سد باب نہیں ہو سکتا۔ میں کتنی بار تم سے کہوں کہ اس طرح چپ رہ کر کسی ایک کی پریشانیاں نہ کم ہوئی ہیں نہ ہوں گی ــــ یہ وہ زمانہ ہے کہ حرکت اور جنبش جس انسان میں نہ ہوں۔ وہ مردہ تصوّر کیا جاتا ہے اور بن روئے تڑپے اس زمانے میں ایک ماں بھی اپنے بچے کو چھاتی سے نہیں لگاتی۔ اس طرح گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے سے کام نہیں چلے گا۔ اور تمھارے ان کے حوصلے اور قوی ہوں گے۔ بال کی کھال اتارنے کی تو تمھاری عادت ٹھہری۔ حالیہ ملاقات میں سب کچھ میں نے کہہ سنایا۔ اور تمھاری ضد ہے اور میں ہر چیز اور ہر واقعہ سے تمھیں روشناس کر دوں۔ . . . . کتنی نادان بنتی ہو ــــ یقین کر لو ــــ نہ میں کشمیر گئی اور نہ ہی وہ کشمیر سے یہاں آئے گئے۔ بس مراسلت

کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ بھی قسمت کے لکھے کے تحت۔ ورنہ کہاں کشمیر اور کہاں جبل پور .... تم اس غلط فہمی کو اپنے دل سے دور کر دو۔ روشن کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ اور ایسا سمجھ لو کہ خداوند ایزدی نے ہم دونوں کو اتنا دور ہونے پر بھی حقیقی محبت کے بندھن میں باندھ کر ہماری محبت کو پروان چڑھایا ہے۔ کیا کہا۔"

"کہیں اس ان دیکھی راہ پر چلنے سے ٹھوکر نہ لگے۔"

روشن! میرا شہباز ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا دل کہتا ہے۔ اور میرے ضمیر کی آواز ہے۔ میں نے اسے چار سال سے پرکھا ہے تب کہیں اسے چاہا ہے اسکے خطوط کی روانی میں گھس کے میں نے اس کے دلی جذبات کو پڑھا ہے۔ مجھے اس کی محبت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ اتنا ہی جتنا کہ اس خدائے پاک کے وجود پر اس کے حاضر و ناظر ہونے پر جسے حقیقت میں ہم نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ ہماری محبت ضرور پروان چڑھے گی۔ اور ہمارا ملاپ دنیائے محبت میں ایک سنگ میل کی حیثیت سے زندہ اور امر رہے گا۔ ہم دونوں صورت سے زیادہ سیرت کے متلاشی ہیں۔ ہم دونوں نے محبت کا گیت ایک ساتھ گانے سے پہلے اور پیار کی ڈگر پر قدم رکھنے سے قبل ایک دوسرے کی شخصیت اہلیت اور انسیت کو کئی طرح سے پرکھا ہے۔ مجھے اپنی پرکھ اور اپنے انتخاب پر فخر ہے۔ اور یقین سے کہتی ہوں کہ شہباز کبھی میرا دل نہیں دکھائیں گے۔ میرا شہباز دنیا والوں سے الگ ہے۔

روشن تمہارا دوسرا سوال بھی بڑا انوکھا ہے۔ محض انوکھا ہی نہیں، بلکہ ٹیڑھا بھی، بارہا میں نے یہی سوال اپنے آپ سے، اپنے دل سے کر دیتا ہوں — مگر

یقین کیجئے۔ میرا دل اور میرا من اس سوال سے شرما جاتا ہے۔ اکثر سوچتی ہوں کہ ان کا سامنا کیسے ہوگا۔"

میرے احساسات کی دنیا حیا کے پردوں میں ڈوب ڈوب جاتی ہے ان سے کیسے آنکھیں ملیں گی؟ اپنے محبوب کا سامنا کس طرح سے کروں؟ دیکھو نا شادی میں مشکل سے بارہ تیرہ دن رہ گئے ہیں۔ اور سہیلیاں و بہنیں اس اس طرح کا سامنا کر ستانے لگی ہیں۔ میں دل مسوس کے رہ جاتی ہوں۔ اور اپنے میں کھوئی کھوئی جاتی ہوں۔ کہ کیا کچھ کس طرح سے ہوگا۔ تیرہ دن اور پھر وصال۔ روشن کیتنے رنگین تھے۔ وہ ایام فرقت۔ چار سال کا طویل عرصہ کتنا مدہوش کن تھا۔ اس مدت میں کتنی لذت تھی۔ شیرینی اور مٹھاس تھی اور اب وہ تڑپ نہیں رہے گی۔ وہ جدائی کے گیت، وہ کپکپی اور وہ سراسیمگی نہیں رہے گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں اپنے دل وجان کے مالک کا کس طرح خیر مقدم کروں گی؟ پہل کون کرے۔ کس طرح سے کرے۔ اس سے کیا کیا کہوں۔ دیکھو روشن اس بارے میں مجھے نہ ترساؤ خوب بنا رہی ہو بہنا یا ـــــ تم تو آرہی ہو۔ خود ہی نپٹ لینا اپنے بھائی صاحب سے جس کی صورت دیکھنے کو تمہارا من بھی کب سے کر رہا ہے۔

روشن مجھے اجازت دو۔ آئے دنوں بڑی پریشانی میں کٹتی ہے۔ دیکھو نا ظفر کل چڑانے کے لئے اتنا تک کہہ گئی کہ شہباز کشمیر کا ہے اور کشمیر دور ہے ہوسکتا ہے کہ شہباز بوڑھا۔ بدصورت یا کوڑھ مغز ہو۔ اور محض بتانے کی خاطر کسی نوجوان، خوبصورت لڑکے کی تصویر بھیجدی ہو۔ دنیا دھوکے باز ہے۔ نہیں نہیں روشن۔ میرا شہباز ایسا نہیں ہوسکتا وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

اس کی شرافت اور لیاقت کو میں پہچان گئی ہوں۔"

اچھا اب منگنی دعوت نامہ میری طرف سے قبول کر لو۔ ضرور آنا۔ منے منی سبل کو بھی لیتی آنا۔ میرا دل بہل جائے گا۔ تمھارے ان کو سلام! انھیں بھی شادی میں لیتی آنا۔ اگر بار خاطر نہ گزرے اور موڈ میں ہوں! میں آمنے سامنے تمھارے دل سے تمھارے ان کی بابت شکایت دور کرنے کی کوشش کروں گی۔"

تمھاری اپنی

زرّین

از جموں۔

پیاری روشن آپا۔!

تمھارے پہلے خط کا جواب مختصر میں نے ارسال کیا تھا۔ اور تم آگ بگولا ہو گئیں۔

واہ! خیر! تمھارا عتاب نامہ جس میں تم نے اپنے بھائی صاحب کے نام بھی پردہ ڈال رکھا ہے میرے زیر مطالعہ ہے۔ باپ رے باپ۔ کیا آنکھیں دکھاتی ہو ـــــ یہ شعلوں کی بارش کس لئے۔ ارے پگلی فرصت نہ ملے تو اس میں میرا کیا قصور! جانِ جگر۔ میری مرنے سے کٹ رہی ہے۔ اس جموں کے ویرانے (پتھروں کا شہر کہوں تو زیادہ موزوں رہے گا) میں ماں باپ کی شفقت حاصل نہیں، بہنوں، کی الفت اور بھائیوں کی شرارت کا ساتھ نہیں۔ اور پھر تم جیسی سہیلیوں کی رفاقت نہیں لیکن جیون ساتھی کے پاس ہوتے

ہوئے مجھے راحت اور فرحت حاصل ہے۔ چین اور اطمینان سے وابستگی ہے۔
میرے شہباز کا ساتھ مجھے حاصل ہے اور میں ہنسی خوشی کاٹ رہی ہوں۔
جب سے جبل پور چھوڑ کے جموں آئی ہوں۔ زندگی ایک خوشگوار انداز سے
گزرنے لگی ہے۔ کتنا فرق ہے اس زندگی میں۔ جبکہ لڑکی ماں باپ کے گھر
میں ہوتی ہے۔ اور اس زندگی میں جبکہ شریک حیات کے سوا کوئی اپنا ساتھ
نہیں ہے۔ اب کیسے کہوں کہ کتنا لطف ہے اس زندگی میں ـــ جو زندگی کبھی
روکھی پھیکی نظر آتی تھی ـــ اس کا ہر ورق رنگین ہو گیا ہے۔ میرے لئے۔
رودشت! یقیناً شہباز کی پیار بھری گود ہر ایک رنگینی سے بڑھ کر ہے۔"
تمہیں کیسے بتا دوں کہ شادی کے بعد میری زندگی میں کیا فرق آیا ہے کس مزے
سے زندگی کے دن کٹ رہے ہیں۔ شام کو دفتر سے لوٹنے پر چائے۔ ایک ساتھ
پینا۔ اور پھر نہر والی پارک میں سیر کو جانا جنت کی خوشیاں بہم کر دیتا ہے۔
اس جموں میں نہر پارک نہ ہوتی تو نصف سے زیادہ آبادی اللہ کو پیاری
ہو گئی ہوتی۔ اس باغ کے دونوں کنارے جامن اور ساگون کے درخت
لگے ہیں۔ دونوں طرف رنبیر نہر بہہ رہی ہے۔ اور تو اور سرکنڈوں کے پاس
موگرے کے پھول اور ان کی مہک سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ شام کا اندھیرا
ندی کا کنارہ، اور ان پھولوں کی مدہوش کن باس۔ مجھے شہباز کی آزاد
خیالی نے برقعے کی قید سے آزاد کر دیا ـــ پہلے پہل میں بہت شرماتی تھی
مگر شہباز کی ایک بھری ڈانٹ نے سب کچھ بھلا دیا۔ وہ عادت بھی جو کبھی

حالات کے جنگل میں پھنس کے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ یہ محبت کا خمار بھی کیا بلا ہے۔ کتنا بے خود کر دیتا ہے۔ یہ انسان کو دنیا سے اور اپنے آپ سے غافل کر دیتا ہے۔

اب دیکھو نا قسم سے تو گھریلو زندگی سے کچھ فالتو وقت ملتا ہے تو وہ انکے ساتھ باتیں کرنے میں اور پیار جتانے میں گزر جاتا ہے۔ تم نے درست کہا تھا کہ مرد مطلبی ہوا کرتے ہیں اور دیکھو نا اتنے دنوں میں گھر والوں سے الگ رکھے میرے جذبات سے کھیل رہا ہے۔ مجھے اس پیار و محبت میں سرشار رہنے دو۔ مجھے مت جگاؤ۔ میں شہباز کے زانو پہ سر رکھے میٹھی میٹھی نیند سونا چاہتی ہوں۔ اگر تمھیں ایک اور بات بتا دوں تو خوشی سے اچھل پڑو گی۔ نہیں بتاؤں گی۔ جاؤ تم سن کر مجھے ستانے لگو گی۔ اس لئے نہ بتانا ہی اچھا ہے۔ خوب ناراض ہونا بھی آتا ہے۔ ناراضگی کا جامہ زیب تن کرنا تو تمھاری عادت بنا ہے۔

لو سنو! کان نزدیک کر لو۔ کوئی سن نہ لے۔ میری روشن میرے پاؤں بھاری لگ رہے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو بات سچ ہی نکلی۔ اب بتاؤ کیسی خوشخبری سنا دی۔

اجازت دو۔ تمھارے بھائی صاحب آ گئے۔ ضد سوار ہے کہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلی جاؤں۔ انکار تو میرے سے نہیں ہو سکتا۔ ویسے دل چاہتا ہے کہ اس وقت اس کے پہلو میں بیٹھ کر پیار کی باتیں کروں۔ پیار بھری۔ جن میں راحت ہے محبت ہے۔ پیار ہے اور آرام ہے۔ مگر وہ مانتے سے رہ گئے۔

لوجی پھر سے پکارنے لگے ہیں۔

خط کا جواب میں نے دیر سے دیا۔ اس کا برا نہ ماننا۔

تمھارا منا منّی کیسے ہیں ان کے ڈیڈی نے رات رات بھر باہر رہنے کا سلسلہ بند بھی کر دیا یا جاری ہے۔ میرے دل میں ایک بات آئی ہے۔ آج سے تم ان کا انتظار رات رات بھر کرنا بند کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔

میں خود ان کی عدم موجودگی میں ایک لقمہ حلق میں نہیں ڈال سکتی۔ پھر بھی کہوں گی کہ منے کے ابا کو درست راہ پہ گامزن کرنے کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ تم ہی اسے صحیح راستے پہ لگا سکتی۔ تمھیں اس ضمن میں بہت کچھ کرنا ہے۔

اچھا اب میں چلتی ہوں۔ وہ باہر صحن میں انتظار کر رہے ہیں۔ دیر ہوگی۔ تو ان کا پارہ چڑھ جائے گا۔ خالہ جان کو سلام عرض کرنا۔

تمھاری سہیلی۔

زرّین

از سری نگر

جگری سہیلی روشن ـــ سلامت رہو۔

وقت کتنا بے رحم ہے۔ اس کا اندازہ اب مجھے واضح انداز میں ہوا ہے۔ یقیناً وقت بڑا تیز گام ہے۔ اور یہ کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔

وہ حسن اس وقت کی گرد نے تجھے میں کے رکھ دیا ہے۔ ایک

گردش نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ میری زندگی کے میری کتاب زیست کا ایک اور ورق الٹ گیا ہے۔ یہ تیسرا ورق کیا الٹا ہے کہ میرے پیار کی دنیا میں آگ سی لگ گئی ہے۔ محبت کے حجرے میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ روشن یہ حقیقت ہے کہ سرینگر ایک خوبصورت شہر ہے۔ قدرتی نظارے۔ دلفریب سبزیاں رنگین تماشے اور حسین چہرے۔ لیکن یہاں مکینوں کی ہر ادا تہذیب و تمدن سے خالی ہے۔ حسن و اخلاق سے دور کٹ رہے۔ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ یہ حسین چہرے میرے پیار کی دولت کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ دلفریب نظارے مجھے بے کسی کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور کریں گے۔ یہ پلک جھپکتے ہی کیا سے کیا ہو گیا! اس خوبصورت شہر کی طرح اس کے بیشتر باشندوں کے دل خوبصورت نہیں ہیں۔ بلکہ عجیب طرح کا تضاد میں نے اس نسبت میں پایا۔

روشن! عجیب قسم کی آزاد طبیعتیں میں نے یہاں کی اکثر لڑکیوں میں پائی۔ ان کی ناروا آزادی بے جا عادتیں اور بے ڈھنگ رہن سہن دیکھ کے میں سمجھتی ہوں کہ اس سری نگر میں آ کے میں نے سب کچھ کھو دیا ہے۔ سب کچھ، اور میں زندگی کی ڈگر پر اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگی ہوں۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ تم سوچتی ہوگی کہ اتنے قلیل عرصے میں کون سا انقلاب آیا۔ مجھے اب بھی اپنے ستشبہانہ پر بھروسہ ہے۔ اعتماد ہے۔ میں اسے

روشنی نہیں ٹھہرا سکتی۔ لیکن کیا کروں اس دنیا کو۔ ان دنیا والوں کو۔ ان پر مجھے بھروسہ نہیں ہے۔ تم ہی انصاف کرو اور بتاؤ ان لڑکیوں کے چال ڈھلن پر کسی طرح سے بھروسہ کروں۔ جو میرے سرتاج کے گلے مل کر اس کی باہوں میں باہیں ڈالے۔ میرے روبرو ان سے محبت جتائیں۔ انھیں اپنی اداؤں کا دلربا رقص دکھائیں نہیں۔ نہیں۔ روشن مجھے ان نظروں پر بھی اعتماد نہیں۔ جو میرے شریک حیات کو ہر وقت انداز دگر سے گھورا کرتی ہیں۔

روشن تم نے درست کہا تھا کہ مرد ایک بھنورا ہوتا ہے۔ کبھی اس ڈالی پر کبھی اس پھول پر۔ شہباز ان مردوں میں سے نہیں۔ مجھے اس پر اب بھی بھروسہ ہے۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ لیکن یاقوت جیسے لب یہ اٹھتے بیٹھتے سینے۔ یہ چڑھتی جوانی کا خمار۔ یہ حسن کی فراوانی۔ یہ ابھرے ابھرے سرخ گلابی گال یہ بدمست ادائیں۔ یہ آنکھوں میں پوشیدہ مستی۔ یہ نارروا آزادی۔ دیکھو نا میں کس کس سے لڑوں۔ اور اس طرح کے ماحول میں شہباز کیونکر پاک و صاف رہ سکتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مرد حسن پرست ہوتا ہے۔ اور اس شہر میں حسن کی بارش ہے۔ میں عجیب کشمکش و پیچ میں پڑی ہوں کہ کیا کروں کس ادا سے کروں۔

میرا شہباز بھی اب دیر سے گھر آنے لگا ہے۔ اور تو اور میں نے اسے چند ایک لڑکیوں سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے سنا ہے۔

کیا کھل کھل کے باتیں ہو رہی تھیں۔ کیسے خوش تھے۔ اور میں اندر ہی اندر اپنی حسرتوں کا خون ہوتے دیکھ کر رویا کرتی تھی۔

مجھے اس شہر سے نفرت ہو چکی ہے۔ یہاں کی ہر چیز سے یہاں رہ کر مجھے لگتا ہے۔ کہ میرا عشق، میرا پیار، اور میری پانچ سالہ ریاضت سب کی سب دریا برد ہو جائے گی۔ اور میں پھر سے تنہا رہوں گی۔ ویران راہ پر، بے مقام راستے پر اور بے منزل گلی کے نکڑ پر بیٹھی ہوں۔ روشن! شہباز بدلے بدلے سے نظر آرہے ہیں۔ میں اب اس کی محبت میں اتنا دم نہیں پاتی۔ اسکی محبت میں اب وہ کشش نہیں رہی ہے۔ دراصل اس مادرِ وطن میں آ کے اس کے دیرینہ قصے پھر سے تازہ ہونے لگے ہیں۔ اور شہباز پھر سے ان رنگینیوں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ ان سے وابستگی اختیار کر لینے کی فکر میں ہے۔ آج کی بات ہے۔ ان کے ایک دوست کی بہن اپنی بڑی بہن کے ساتھ ملنے کے لئے آئی۔ بڑی بہن میرے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اور چھوٹی بہن برابر اسے گھورتی رہی۔ وہ دونوں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو نام و پیام سنانے لگے۔ میرے روبرو ایسا ہونے لگا ہے۔ عدم موجودگی میں کیا ہوتا ہوگا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

اچھا ہوا تم جبل پور جا رہی ہو۔ یاد رکھنا بہنوں سے کچھ بھی نہ کہنا۔ انھیں دکھ ہوگا۔ اور والدین کو صدمہ ہوگا۔ میں بھگت لوں

گی۔ جو میری قسمت میں ہوگا۔ اور پھر شہبانہ کو تو میں نے خود چاہا ہے۔"

یہ میری اپنی پسند ہے۔ نہ کہ والدین اور بہن بھائیوں کی چاہت۔ میں ان سے کیسے اور کیا کہوں۔ جبکہ ساری آگ میرے اپنے ہاتھوں کی لگائی ہوئی ہے۔ مرد واقعی گرگٹ ہوا کرتے ہیں۔ اگر سری نگر سے وابستگی رہی تو مجھے نہ جانے کس جان لیوا انقلاب سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔ کاش میں مر جاتی اپنے غلیظ بوجھ سے اس دھرتی کو آزاد کرتی۔ لیکن کیا کروں۔ پیٹ میں بے گناہ اور معصوم آ بسا ہے۔ اسے کیا کروں۔ اس نے مجبور کر رکھا ہے۔

اب منّا کے ابّا گھر میں شراب لے گئے ہیں۔ اف کس قدر بگڑ جاتے ہیں۔ یہ مرد! کس پستی میں جا ڈوبتے ہیں۔ فکر نہ کرو روشن! دنیا امید پر قائم ہے۔ سب کچھ درست ہو جائے گا۔ وقت آئے گا۔ اور ضرور آئے گا۔ جب وہ اپنے کئے پر پچھتائے گا۔ آنے والی صبح کا سورج میرے لئے کیا پیغام لائے گا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔" خدا حافظ۔

تمھاری بدنصیب

زرّین

عید

انسان! تو نہ جانے کیا کچھ چاہتا ہے۔ لیکن تقدیر اس کے حسین خوابوں کے سلسلہ کو پریشان کر دیتی ہے...... بدقسمتی اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیتی۔ اور وہ تقدیر کے چکر میں کھو کے رہ جاتا ہے۔ فقط اپنی بے بسی پر چند قطرے آنسو بہانے کے لئے کتنی حسین دنیا بساتا ہے۔

بیچارہ انسان...... میں کیا کروں گا۔ میں وہ کروں گا۔ لیکن تقدیر کا چکر اسے وہیں اپنی بے بسی پر رونے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ وہ خیالات کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ لیکن ان کو تند و تیز ہوا کے ایک ہی جھونکا فضا میں بکھیر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی بسائی ہوئی دنیا کو اصلیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ لیکن نہیں رنگ سکتا! دنیا والے اس کے بیرونی رنگ ڈھنگ اور جھوٹی سجاوٹ کو ہی دیکھتے ہیں۔ اور اندر چھپی ہوئی حالت کا جائزہ نہیں لیتے۔ جہاں ویرانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہی حال ریاض کا تھا۔ اس کی زندگی بھی ایک ایسے ویرانے میں

کھو کر رہ گئی تھی......جہاں خوشی نہیں.....شانتی نہیں۔ جہاں صرف دکھ اور ویرانیاں تھیں۔ قسمت کے ہاتھوں لٹا ہوا ریاض ایک ایسے چکر میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ جہاں زندگی اور موت میں بہت ہی کم فاصلہ تھا۔

.....گھپ اندھیری رات تھی۔ کائنات سہمی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کسی خواب میں کھو چکی تھی۔ سارا عالم نشۂ نیند میں سرمست اور مدہوش پڑا تھا۔ ہر سمت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اندر ریاض بستر مرگ پر تڑپ رہا تھا۔ اور باہر دالان میں بیٹھی راشدہ سوچ رہی تھی کہ آج کل کے دن کتنے افسردہ اور سوگوار ہیں۔ صبح و شام کتنے المناک اور سنسان ہیں۔ راتیں کتنی تاریک اور ڈراؤنی ہیں.....ہر طرف اُداسی اور مایوسی.....ہر سمت مصیبت منہ کھولے کھڑی!.....اف! زندگی بھی ایک بوجھ سی ہو کر رہ گئی ہے... یا خدا! یہ غمناک تاریکیاں اور بے انتہا پریشانیاں کب تلک اور کیونکر؟ .....آخر آلام و مصائب کا کب تک خاتمہ ہو گا.....کب اس دکھ سے نجات ملے گی"۔

آج اس کا بھائی ریاض......صرف ایک بھائی جو اس کی امیدوں کا واحد مرکز ہے۔ تین ہفتوں سے بیمار پڑا ہے۔ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں اور پھر پرسوں تو عید بھی ہے۔

انہی خیالات میں غرق راشدہ اٹھی اور ریاض کے پاس آ گئی۔ کمرے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغ گور کی مانند ایسی سرخ روشنی چھڑک رہا تھا۔ جیسے ڈوبتی ہوئی اداسی پھیلا رہا ہو۔ ریاض کسی طرح

انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیا کی چارپائی کے پاس ہی ایک پھٹے ٹاٹ پر راشدہ بیٹھی اور بھیا کے بے رنگ چہرے کو دیکھنے لگی......

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی...... لیکن راشدہ سوئی نہیں... ماضی کے ہلکے نقوش اس کی نگاہوں میں ابھرنے لگے...... گئے گزرے واقعات وہ تین چار سال سے اس غلیظ جھونپڑی میں اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے...... بے بسی کے عالم میں...... لیکن پھر بھی وہ کتنے خوش ہیں۔ کہ وہ دنیا کے شور و غل سے دور تنہائی میں رہتے ہیں۔ جہاں انھیں تنگ کرنے والا کوئی نہیں..... جہاں بھائی بہن کی حقیقی مسرتوں کو پامال کرنے والا کوئی نہیں ــــــ وہ یہاں کیوں آئے؟ وہ بھی دن تھے۔ جب وہ اپنے والدین کے ساتھ شہر میں رہتے تھے...... باپ جس سے گھر والوں کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ اچانک بیماری کی زد میں آگیا۔ اور اس کی بیماری کی نذر ہو گیا ــــ لیکن بے سود...... وہ موت کے چنگل سے بچ کر نہ نکل سکا...... اور ایک تخ بستہ رات ہمیشہ کے لئے اپنے بچوں سے روٹھ کر چلا گیا۔

- وہ کرایہ کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ باپو کی رحلت کے بعد پریشان حالی نے اپنی لپیٹ میں کیا لیا کہ کوارٹر چھوڑ کر بستی سے دور بوسیدہ جھونپڑے میں قیام کرنا پڑا ــــ مسلسل پریشانیوں سے تنگ آکر وہ یہاں آگئے۔؟

ریاض نے تعلیم کو خیرباد کہہ کے شہر کی فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ گھنٹے دنوں میں ...... دن ہفتوں میں اور ہفتے سالوں میں بدلتے گئے تمام رنج و دو دنوں نے

اپنے جائز مطالبات منوانے کے لئے اسٹرائک کر دی...... فیکٹری کے مالک نے مطالبات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اور مزدور روزانہ فیکٹری کے سامنے مظاہرے کرتے...... یہ زور مظاہرے ___ ریاض روزانہ راشدہ کو حالات سناتا اور فکر؛ تخیل کا پنچھی راشدہ کی دماغی وسعتوں میں پرواز کرنے لگا۔

مزدور روزانہ شہر میں گشت لگاتے لگاتے تنگ آ گئے تھے۔ فیکٹری کے سیٹھ نے ان کے مطالبات پھر رد کر دیئے۔ آخر تنگ آ کر مزدوروں کی ایک ٹولی نے فیکٹری کے ایک حصّے کو نذر آتش کر دیا ___ اور ساتھ ہی سرمایہ دار...... مردہ باد ___ "غریب مزدور...... زندہ باد" کے نعرے لگاتے رہے ___ دوسری طرف مزدوروں کے سر کردہ کارکن زور دار اور اشتعال انگیز تقریریں کر رہے تھے۔ سب نے باری باری تقریریں کیں"۔ ریاض نے بھی کہا کہ اس طرح سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کے آگے جھکنا ہماری انتہائی پست ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے...... یہ لوگ ہماری شب و روز کی انتھک کاوشوں سے سرمایہ دار بن گئے ہیں...... ہمارا خون چوس کر، ہمت سے کام لو۔ انشاء اللہ ہم اپنے مطالبات منوا کر ہی دم لیں گے...... خیال کرو فلک بوس عمارتوں اور عیش و عشرت کے گہواروں میں جھولنے والے سرمایہ دار کس طرح رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور عیش و عشرت سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں ___ لیکن ہم دن رات کام کرنے والے مفلسی میں گرفتار ہیں۔ ہمارے بچوں کے

نوالے کو ترس رہے ہیں۔ ان کی پوشاکیں دیکھو۔ باریک ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہیں لیکن مقدس چیتھڑے بھی میسر نہیں۔ ہمارے بچوں کو تن ڈھانپنے کے لئے کچھ بھی نہیں ـــــ ہم میں رواداری اور اتحاد ہونا چاہیئے۔ یاد رکھو زمانہ انقلاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حوصلہ رکھو۔ وقت نزدیک ہے۔ جب یہ سرمایہ دار انقلاب کی تند و تیز موجوں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور حکومت کی باگ ڈور ہم لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ پھولے ہوئے پیٹ ہمارے محتاج ہوں گے" ـــــ پولیس آگئی اور چیدہ چیدہ مزدوروں کو پکڑ لے گئے۔ ان میں راشدہ کا بھائی ریاض بھی تھا ـــــ دوسرے مزدوروں کے ساتھ ریاض کو بھی عدالت سے ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی ـــــ یہ وقت انھوں نے کس طرح گزارا؟ ...... یہ وقت! اف کس طرح ماں اور بیٹی دونوں جہنم جیسے وسیع پیٹ میں ایندھن ٹھونس کر بھرتی رہیں۔

راشدہ شہر جاتی اور بھیک مانگ کر لاتی۔ غرضیکہ یہ وقت انکے لئے انتہائی مشکل اور دشوار تھا ـــــ اتنا دکھ سہنے کے بعد بھی ہر حالت میں رب العزت کا شکر ادا کرتی رہیں ـــــ اسی دوران میں راشدہ کی ماں ریاض کے غم میں بیمار رہتی۔ چارپائی پر لیٹی کر ساتھ مہینے تک اسے نہ چھوڑا اور پھر اس وقت جبکہ ریاض ایک سال کے بعد جیل سے رہا ہوکر آیا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ ...... چہرے پہ جھریوں کا وسیع جال ...... آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ...... شکل اور صورت وضع قطع بھی کسی حد تک بدل ہو گئی تھی ـــ ریاض کے آنے کے دس دن بعد ماں نے بستر مرگ سے

اس بے وفا دنیا سے بے کسی اور بے بسی کی حالت میں منھ موڑ لیا۔"

اتنا کچھ سوچنے کے بعد راشدہ اٹھی اور باہر برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ اب چاند نے اپنی آب و تاب کے ساتھ ہر شے کو منور کر دیا تھا۔ اس نے سامنے قبرستان پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ جہاں ایک تربت پر چنبیلی کا نازک پودا جھوم رہا تھا...... راشدہ ایک گہری سوچ میں پڑ گئی ــــ"

"تمام لوگ یہاں برابر ہیں۔ کیا غریب اور کیا امیر ــــ وہ بادشاہ۔ جو دنیا کے ایک حصہ پر حکومت کرتے تھے۔ اسی خاک میں مل گئے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ دولت کے سائے میں ناچتے اور رنگ رلیاں مناتے رہے۔ خالی ہاتھ ہی پیوند خاک کر دئیے گئے.......

ابھی راشدہ اپنے خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی کہ "کھوں" "کھوں" کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ تڑپتی ہوئی بھیا کی چارپائی کے پاس گئی۔ لیکن وہ برابر بے حس پڑا رہا ــــ اپنے بھیا کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر راشدہ گھبرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو سمٹ آئے۔ اور بھیا کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ اور راشدہ بدستور جاگ رہی تھی۔ وہ کئی بار اپنے بھیا کو دیکھنے کے لئے اٹھی۔ اب سیاہ و سفید دھبے فضا میں مل جل کر سحر کی تعمیر میں منہمک تھے

......اچانک ریاض نے آنکھیں کھولیں اور ساتھ ہی کھانے کے لئے کچھ طلب کیا۔ آج ریاض نے پورے تین دن کے بعد کھانے کو کچھ مانگا تھا۔ لیکن گھر میں تھا ہی کیا جو راشدہ اسے دیدیتی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اپنی پھوٹی قسمت

پر آنسو بہانے لگی۔ وہ رواں دواں چودھری اسحاق کے گھر چلی گئی۔

“کیا بات ہے راشدہ بہن؟” چودھری کی بیٹی طلعت نے کہا۔ کیوں خیر تو ہے۔؟”

“بہن طلعت خیریت تو ہے۔ لیکن میں آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ بھیا بیمار ہیں۔ اور انھوں نے آج کئی دن کے بعد کچھ کھانے کو مانگا ہے اس کے لئے تھوڑا سا دودھ چاہیئے اور ۔۔۔۔۔۔ اور” ہاں، ہاں اور کیا؟” طلعت نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

یہی کہ ڈاکٹر نے دوائی دینا بند کر دی ہے۔ اگر آپ کچھ مدد کر سکیں تو۔۔ ۔۔۔ تو ان کی دوا کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ خداوند آپ کو جزا دے گا۔ آپ کے والدین ہمیشہ خوش و خرم رہیں گے۔” راشدہ یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

“راشدہ یہ لو دودھ اس کٹورے میں ڈالو اور ہاں یہ لو کچھ پیسے۔ اس وقت میرے پاس یہی ہیں۔” بہن سکھی رہو۔ ربّ العزت آپ کی زندگی کا چمن سدا پھولا پھلا رکھے۔”

— اور راشدہ دوڑتی ہوئی بھیا کے پاس آئی۔ دودھ پینے کے بعد ریاض نے ذرا ہوش سنبھالا۔ اسے یاد آیا کہ کل عید ہے۔ مسلمانوں کے لئے خوشی منانے کا دن ۔۔۔۔۔ مسرت سے بھرپور ۔۔۔۔۔ لوگ رنگ برنگ کے کپڑے پہنے خوشیاں منائیں گے ۔۔۔۔۔ اور ہمارے گھر میں کچھ کھانے کے لیے ہیں ہے۔ ایسے [illegible]

کا پھل آج ہی مانگوں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پیسے آج نہ لایا تو عید بے مزہ ہو جائے گی۔ بہن کے لئے کپڑے وغیرہ کہاں سے آئیں گے۔ اور پھر کھانے کو کیا ہو گا۔

"راشدہ کل عید ہے۔ میں آج سیٹھ صاحب سے حساب وغیرہ چکا لوں گا ـــ" یہ کہتے ہوئے ریاض نے پیوند لگا کرتہ اور پہتہ بند جلد جلد پہنا ـــ راشدہ نے ہزار نصیحتیں کیں۔ بھائی کو روکنا چاہا۔ مگر ریاض نے ایک نہ سنی۔ چودھری کے ہاں سے لائے ہوئے کچھ روپے لے کر ریاض شہر کی طرف بلبے ناگ کی طرح بل کھاتی اور رنگیتی پگڈنڈی پر ننگے پاؤں چلتا بنا وہ ایک مزدور ہی تو تھا۔ بے بس مزدور.... جو خون اور پسینہ ایک کر کے روٹی کماتا ہے۔ جو تمام دن شہد کی مکھی کی طرح کام میں مصروف رہتا ہے..... لیکن اپنی زندگی کو درخشاں اور خوشگوار بنانے کی خاطر کچھ نہیں کر پاتا۔ مفلسی میں پلی راشدہ باہر کھڑی اپنے لاغر بھیا کو دیکھنے لگی۔ جو بھاری قدموں کے ساتھ پیچ در پیچ پگڈنڈی پر جا رہا تھا...... ریاض اب بہت دور جا چکا تھا۔ صرف اس کے سر کی سرخ پگڑی نظر آ رہی تھی۔ جو آہستہ آہستہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی گئی۔ راشدہ نے انگڑائی لی۔ اور شیشم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور سوچنے لگی۔

"یہ دنیا بھی کیا ہے۔ جہاں دردمندوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ جہاں بے کسوں کے ارمانوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ جہاں بے نسوں کی جیتی جاگتی امنگوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ جہاں کمزوروں کا حق جبراً

اور زبردستی چھین لیا جاتا ہے۔ جہاں پھول چننے والوں کی راہ میں کانٹے بکھیر دیئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اف خدایا "یہ زندگی کیا ہے۔۔۔۔۔۔ نامراد زندگی۔۔۔۔۔۔ جس میں نہ سکھ نہ خوشی۔۔۔۔۔۔ کل عید منائی جارہی ہے۔۔۔۔۔۔ اور ہمارے یہاں کھانے کو کچھ نہیں۔ راشدہ کے چہرے سے انتہائی رنج و غم ٹپک رہا تھا۔"

اتنا کچھ سوچنے کے بعد راشدہ کی آنکھوں سے دو موتی ٹپکے اور اس کے پچکے ہوئے گالوں پر پھیل گئے ــــ جب شام ہوگئی تو جھونپڑی کے نزدیک ہی ایک ٹیلے پر بیٹھ کر راشدہ ریاض کا راستہ دیکھنے لگی۔ ۔۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔۔۔۔۔۔ اس نے دور نظر دوڑائی۔۔۔۔۔ چار آدمی ایک چارپائی کو اٹھائے اس کی جھونپڑی کی طرف آرہے تھے۔

ــــ راشدہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ــــ کچھ دیر بعد ان آدمیوں نے چارپائی راشدہ کی جھونپڑی کے پاس رکھ دی اور چلے گئے۔

"راشدہ۔۔۔۔۔۔ بہن راشدہ۔"

"ہاں بھیا" ــــــ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ "ہاں بھیا تمھیں یہ کیا ہوا ہے۔ یہ پٹی کیسی۔"

"بہن" ــــ ریاض کراہنے لگا۔ "غریبوں اور بے بسوں کا اس دنیا میں بہت برا حال ہے۔ راشدہ ہمیں آئے دن مسلسل ظلم و ستم سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ دکھ اور دیرانیاں ہمارے لئے ہی ہیں۔ راشدہ ہم

مفلسی کے وسیع صحرا میں پیدا ہوئے اور اسی صحرا میں بوجھل دن گزار کر چلے جائیں گے۔" ریاض کی آواز فضا میں تحلیل ہو گئی۔

"لیکن بھیّا! یہ حالت کیونکر؟"

"ہونا کیا تھا بہن! سیٹھ سے کہا تھا۔ کل عید ہے میرا حساب چکا دو۔ اس نے کہا پرسوں آنا ـــــ میں نے بڑی منت سماجت کی لیکن وہ بچھو کی سی مونچھوں والا جو اپنے زہریلے ڈنک سے ہم جیسے غریبوں کا خون چوستا ہے۔ ہرگز نہ مانا۔ راشدہ! میں لگاتار رات کو دوسرے مزدوروں کے ساتھ اس ظالم کا مکان بناتا رہا........ صرف تمہارے لئے........ کہ اپنی بہن کو کسی کے سپرد کر دوں گا ـــــ جہیز میں دینے کے لئے کچھ چیزیں بناؤں گا... اچھے کپڑے بناؤں گا ـــــ کیونکہ فیکٹری کے پیسوں سے تو پیٹ کی آگ بھی بجھنے نہ پاتی تھی۔ لیکن راشدہ میرے خیالی محل مسمار ہو گئے۔ میری امیدوں پر پانی پھر گیا ـــــ جبکہ آج بھی خلاف امید وعدہ کر کے اس بیدرد نے کچھ نہ دیا........ وہ ظالم...... وہ سنگدل...... جس کا ...... پیشہ...... جور و ظلم...... ہے اور جو......"

"میرے بھیّا یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے" راشدہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"بہن!" بخدا۔ میں نے ایک بار پھر اس پتھر دل سے رحم و انصاف کی بھیک مانگی...... دامن پھیلایا...... لیکن اس کے جواب میں مجھے دھکے دے کر بنگلے سے باہر کر دیا گیا...... آہ! کون سا گناہ کیا تھا میں نے

صرف اپنی محنت کا پھل مانگا تھا۔

راشدہ! پھر میں وہاں سے بے بسی کی حالت میں چلا۔۔۔۔ میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے!۔۔۔۔ میرا دماغ گردش میں تھا ــــ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ــــ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں اور کہاں جاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔ اپنی بے بسی اور بے کسی پر رو رہا تھا کہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں اور کل عید ہے۔

سڑکوں پر ٹانگوں اور بسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔۔۔۔ شاید میری قسمت میں ایسا ہی تھا۔۔۔۔ میرا دماغ چکرا گیا۔۔۔۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔۔۔۔۔ اور ایک ٹانگے کی زد میں آ گیا۔۔۔۔ فیکٹری کے چند مزدور مجھے یہاں اٹھا کر لائے۔۔۔۔۔ کیونکہ میں مرنے سے پہلے اپنی بہن کو دیکھنا چاہتا تھا"

راشدہ کی آنکھوں سے اشکوں کی سفید دھار بہہ نکلی اور بولی۔

"بھیا تم گھبراؤ نا میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں ــــ اف کتنا خون نکل رہا ہے۔

نا بہن نا! اب۔۔۔۔ تو میں۔۔۔۔ بہت دور۔۔۔۔ جا چکا۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ بہت۔۔۔۔ دور۔۔۔۔ اور واپس نہیں۔۔۔ آسکتا۔ اب مجھے۔۔۔۔ کوئی چیز۔۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔ کر سکتا۔۔۔۔۔ ربّ العزت کو۔۔۔۔ یہی منظور۔۔۔۔ تھا۔۔۔۔ تمھیں۔۔۔۔ اللہ صبر۔

... عطا کرے ...

جاؤ ا رشدہ ... کل عید ... ہے نا ... بازار ... جا کر ...
کچھ اپنے ... لئے خریدو ... تاکہ تم ... بھی ... عید ... سہیلیوں ..
... کے ساتھ ... ہمیشہ کی ... طرح ... منا سکو ۔ اور ... ہاں
بہن ... میرے پاس ... کچھ پیسے ... بچے ... ہیں ۔ یہ لو ... اور
اپنے ... کھانے ... کے لئے ... بھی کچھ ... لے آؤ ... میں
جانتا ... ہوں ... کہ تم ... نے دو ... دن ... سے کچھ ...
نہیں ... کھایا ... ہے ... بہن ... یقین کرو ... ریاض
... چند ... گھڑیوں ... کا ... مہمان ... ہے ... اُف
خدایا"

"بھیا تم ٹھیک ہو جاؤ ۔ بس میرا کھانا ۔ میری عید وہی ہے" ۔ میں رمضانی بابا کو بلوا کر ڈاکٹر کے پاس بھیجوں گی ۔ تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ ضرور"

"بہن (ریاض بات کاٹتے ہوئے بولا) بہن ... جاؤ ... اپنے لئے کچھ ... لے آؤ ... یاد ہے ... تم نے ... مجھ سے ...
ایک دن ... کہا ... تھا ... کہ عید ... پر ... چوڑیاں ...
لے آنا ... تو ... جاؤ ... ان پیسوں ... سے ... چوڑیاں ...
خرید کر ... لاؤ ... میں ... تو تم ... سے اب ... ابا جان ..
اور ... امی جان ... کی طرح ... ہمیشہ ... کے لئے ... دور ...
بہت دور ... جا رہا ہوں ... اف خدایا ... ایک ... بدنصیب

.... بھائی..... اپنی..... اکلوتی بہن..... کے..... ہاتھ..... پیلے نہ کر سکا۔" اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔

"پروردگار، میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ کیا میرا آخری سہارا بھی تجھے منظور نہیں۔ خداوندا! کس گناہوں کی پاداش میں مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ والدین کے بعد یہی میرا سہارا ہے۔ اُف ریاض تمھیں یہ کیا ہو گیا۔ بھیا میں لٹ گئی۔" راشدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔

ریاض نے راشدہ کو آخری بار سینے سے لگانے کے لئے چارپائی سے اٹھنا چاہا۔ لیکن اٹھنے کی سکت موجود نہ تھی۔ ابھی پورا اٹھا بھی نہ تھا کہ گر گیا۔ اور ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ اور راشدہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ راشدہ کی دنیا لٹ گئی۔

عید کا جشن گاؤں کے کونے کونے میں بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔۔۔ ہر طرف خوشی کے ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ ہر سمت مسرت اور شادمانی ٹپک رہی تھی اور اسی شور و غل میں بچوں کی ایک ٹولی پتھروں سے کسی کا پیچھا کر رہی تھی۔

"...اوہ! یہ راشدہ تھی..... جو چلا رہی تھی ـــ پاگل راشدہ... بے کس راشدہ..... جو کہہ رہی تھی۔ "ریاض بھیا! آؤ۔ میرے ساتھ عید کی خوشی مناؤ۔" سر پر بھیا کی سرخ پگڑی لئے راشدہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اِدھر اُدھر گلیوں میں پھر رہی تھی ـــ بے ارادہ، بے مطلب...!

۱۴۶

بستی بستی صحرا صحرا

....زرّین.... اوہ! زرّین میرے دل کے قہقہوں پر جیسے ہزاروں زنجیریں ڈال دیں...... تم نہیں آئیں... صرف تصوّر اور یاد ــــ زرّین کہاں ہو؟ زرّین کہاں ہو؟ ــــ میں پاگل ہو رہا ہوں ــ میں بے بسی کو اپنائے تمھیں یاد کر رہا ہوں.... لیکن تم.... خیر تمھیں میری بے بسی سے کیا ــــ زرّین! میں تنہا ہوں ــ بالکل تنہا ــ ایک میں اور میری تنہائی ــ میں اداس ہوں..... حد سے زیادہ اداس..... دیکھو میری حالت کیا ہو رہی ہے..... میں سب کچھ کھو چکا ہوں ــ زرین تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا ــ میں ساری دنیا کو جلتا ہوا دیکھ رہا ہوں ــ میری لکھنے اور سوچنے کی صلاحیت جواب دے رہی ہے۔ کوئی خوشی سے قہقہے لگاتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ میری ہار پر ہنس رہا ہے.... میری بد قسمتی یہ ــ زرین

کیا اب کبھی تم نہ آؤ گی..... کیا اب بھی تمھارا دل ملنے کو نہیں چاہتا۔

جائے گی۔ آجاؤ زرّین تمھیں جتائے گئے پیار کا واسطہ آج محبت کی لاج رکھو۔

آجاؤ زرین .... دیکھو میں دیوانوں طرح بڑبڑا رہا ہوں۔

زرّین تم مجھے بہت یاد آتی رہیں۔ تمھاری یاد کی شدت اتنی بڑھ گئی ہے کہ تن من میں آگ سی لگا دی ___ آج تو ساری رات جاگتا رہا۔ اور جہنم جیسی گرم رات میں تمھاری سرد مہری کو یاد کرتا رہا ہوں۔ آج دن بھر بھی یہی سوچتا رہا کہ میں تم سے اس قدر قریب کیسے آگیا.... جبکہ میں محبت کا مذاق اڑایا کرتا تھا...... ہاں! ہاں تمسخر اڑایا کرتا تھا ___ اور تم نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شکست دیدی۔ میری گردن کو محبت کی چوکھٹ پہ جھکانے والی تم ہو۔ یہ سب کیسے ہوا ___ کچھ سمجھ میں نہیں آتا... تم نے ... قلیل مدّت میں تم نے میرے ارادوں کو خاک میں ملا کے مجھے محبت کی دشوار راہ پہ کھڑا کر دیا..

...... یہ سب کچھ کیسے ہوا۔؟

___ زرّین آخر تیری کس ادا نے میرا دل موہ لیا ...... اف میں کچھ نہیں سمجھ پاتا ___

...... زرّین تم ہی آکے سمجھا دو نا ___ لیکن تمھیں کیا پڑی ہے کہ میرے درد کا علاج کروا ___ خیر ہم تم پرانی یادوں سے ہی دل بہلایا کریں گے۔ وہ یادیں کیا میرے لئے کم ہیں ..... ان یادوں میں صرف تم ہی تم بسی ہوئی ہو۔ اور انہیں کوئی بھی مجھ سے جدا نہیں کر سکتا ___ زرّین مجھے افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ تم مجھے پہچان نہ سکیں ...... تم نے مجھے پہچاننے میں جلدی کی اور میرے دل کی گہرائیوں میں کھو کر بھی میرے درد کو نہ جان سکیں۔

..... مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔

"زرّینہ! اگر تمھیں ایسا ہی راستہ اپنانا تھا۔ تو محبت کے راگ الاپے ہی کیوں تھے؟ تم نے اپنی زلفوں کو پریشان ہی کیوں کیا تھا۔۔۔۔ جواب دو زرین؟ تم نے مجھے اپنا گرویدہ بنا کے محبت کی پرخار وادی میں کیوں ڈھکیل دیا۔؟ یاد رکھو! وہ وقت دور نہیں جبکہ گزرے ہوئے زمانہ کی ایک ایک یاد اجاگر ہو کے تیرا سکھ چین اور آرام لوٹنے میں کامیاب ہو جائے گی

یقین مانو زرین! یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم سامنے نہیں ہو۔ میں تمھارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ ادھر جس گھڑی سے ملازمت اختیار کی۔ اسی وقت سے میرے دل و دماغ پر دفتر کی ہیبت ناک موٹی موٹی فائلیں اور بہی کھاتے چھائے ہوئے ہیں۔ جس میں انگنت لمبی لمبی رقمیں درج ہیں۔ اور ان فائلوں کا وزن بڑھانے کے ساتھ رقموں کے اتار چڑھاؤ سے میرا سر بری طرح سے گھومتا رہتا ہے۔ کہ اگر تمھارا خیال بھی آیا تو سارا حساب چوپٹ ہو جائے گا۔

ایمان کی پوچھو! جب سے ملازم ہوا ہوں۔ دماغ ایک وحشت ناک قبرستان معلوم پڑتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔ بھلا سوچو تو جس دل میں تمھاری یاد نہ ہو اور جس دماغ میں تمھارا گزر نہ ہو ـــــ وہ کیسے گلزار کہلایا جا سکتا ہے ـــ

بہرحال اس سنسان قبرستان میں کل تمھارا گزر۔ ہو ہی گیا اور پھر ایک دفعہ دل و دماغ میں ہیجان سا پیدا ہوا۔ [illegible]

وصلت تھی ۔ اور میں تمہارے ساتھ ایک بار پھر "جھیل ڈل" کے کنارے پر پہنچ گیا ...... اور ہم چنارے کے نیچے گھاس کے نرم نرم قالین پر بیٹھے راز و نیاز کی گفتگو کر رہے تھے ۔

چاند نے اپنی نورانی صورت سے ہر شے کو منور کر دیا تھا ۔ ہمارے سامنے ایک حسین و دلفریب اور دل آویز جھیل پھیلی ہوئی تھی ..... جس جھیل میں زرین تمہارے خیالات کی وسعت تھی ...... تیری آنکھوں کی نیلاہٹ اور قلب کی گہرائی تھی ۔ اس خوشنما جھیل میں بے شمار چھوٹی چھوٹی موجیں اٹھ رہی تھیں ..... اور ہر موج میں ایک چاند ڈوبا ہوا تھا ۔ وہ چاندنی سے ملبوس موجیں ، ناچتی اچھلتی اور کودتی ہمارے قدموں تک پہونچ رہی تھیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے چاند کو ہمارے قدموں میں چھوڑ کر واپس جا رہی تھیں ۔ نہ جانے کتنے چاند بھرے سے تھے جو اس جھیل میں جمع ہو جاتے تھے ۔ ساتھ ہی خراماں خراماں ہوا چل رہی تھی ...... آس پاس کے پھولوں سے لدی ٹہنیوں کو اس انداز سے ہلاتی تھی کہ پھولوں کی بارش ہو جاتی ۔ کبھی کبھی بادام کے پھولوں پر نظر جمائے ہوئے ایسا جان پڑتا تھا کہ برف کے گالے پڑ رہے ہوں ۔ لیکن میں ان چیزوں سے بے نیاز ہو کے تمہارے چہرے کو تکتا تھا ...... پر از جذبات چہرے ...... بدن کو شرما دینے والی کالی کالی چمکدار آنکھیں ..... یاقوت جیسے لب ..... کشادہ پیشانی ..... اور برسات کی راتوں

تمھیں تک رہا تھا۔ زرین میں تمھیں دیکھ رہا ہوں...... کچھ یاد ہے مجھے سکتے کی حالت میں دیکھ کے تم جھینپ سی گئیں اور اس جھینپ کو مٹانے کی خاطر تم سامنے والی پہاڑی کے دامن میں واقع بنگلوں کو دیکھنے لگیں۔

"شادی کے بعد تم بھی ایک ایسا بنگلہ بنا دینا—" تم بولیں "زرین یہ سب سرمایہ داری کے محل ہیں۔ جو غریبوں، بےبسوں اور لاچاروں کا خون چوس کر تعمیر ہوئے ہیں۔ اور ریت پر کھڑے ہیں۔ ہمارا محل تو محبت کی سنگلاخ زمین پر تعمیر ہوگا۔"

"پھر ہم دونوں دہریوں جیسی باتیں کرنے لگے؟" تم روٹھ گئیں۔ زرین۔ نہ جانے تم روٹھ کیوں جاتی تھیں۔ اور اس دفعہ بھی میں تمھیں حسبِ عادت منانے لگا "میری روحِ رواں! میری اچھی زرین— میں نے خوشامد کے انداز میں کہا— لیکن پھر بھی تم خاموش رہیں— نہ جانے کیوں؟ اور پھر میں فرطِ محبت میں اپنا سر تمھاری گود میں رکھ کے لیٹ گیا— تمھاری نظریں جھک گئیں— اور میرے الجھے ہوئے بےترتیب بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگیں— اف کتنا سکھ اور آرام مجھے اس وقت ملا تھا۔ جب تم نے اپنا ماتھا میری پیشانی پر رکھ دیا۔ تمھارا۔ تمھارے نازک ہاتھوں کا لمس میری رگ رگ میں پیوست ہو کے مجھے شانتی کا پیغام دے رہا تھا...... اور میں آپ کو پریشانی کے وسیع صحرا کے بجائے ایک بار پھر خوشی کے گہرے ساگر میں غوطہ زن پاتا تھا۔

کاش... کاش زرین تم میری الجھنوں، مشکلوں اور دشواریوں کو دور کرنے کے لئے ہمیشہ میرے ساتھ ہوتیں۔ پھر تو زندگی پھیکی سی اور بے مفہوم نہ جان پڑتی تم میرے بالوں سے بدستور کھیل رہی تھیں........ نہ جانے کتنی دیر تک

..... اور میں سوچ رہا تھا...... ان جھونپڑیوں کے بارے میں اور ان عالیشان محلوں کے بارے میں...... میں برابر سوچ رہا تھا.... اور میری نظر اس قلب والی عالی شان بلڈنگ پر بھی لگی تھی۔ جس میں صرف چند نیم ہندوستانی کھولے سے کھولا ملا کر ناچنے کی پریکٹس کر رہے تھے۔ اور رقص کرتے کرتے کلب ہال میں آسودہ اور خوش حال قہقہے بلند ہو رہے تھے......

اُف تفریق کی کیسی گھناؤنی تصویر ہے کہ ایک طرف ہزاروں خاندان جھونپڑیوں میں بے سروسامانی کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں... انھیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی اور دوسری طرف رقص کا بازار گرم ہے۔ شراب کے پیالوں کی جلترنگ بج رہی ہے۔ اس کلب ہال میں سینکڑوں خاندان پناہ لے سکتے ہیں ــــ لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے..... ایسا نہیں ہوگا...... کیونکہ اس ناچ و رنگ کے مقابلے میں ان ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بے قیمت اور بے وقعت ہیں۔ وہ کلب سرمایہ داروں کے لئے عیش و عشرت، آنند اور مستی کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ لیکن دیرپا نہیں..... میرے نزدیک تو ان محلوں سے لاکھ بہتر وہ جھونپڑا

مکر و فریب کی بستی سے دور نیلے آکاش سے ہم کلام ہے۔"

میں نے بے حیائی میں تمھیں جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ اور تم سہمی سہمی ساری بکواس سنتی رہیں۔

"اگر تم راضی ہو تو ان جھونپڑوں تک ساتھ پرواز کروں" ۔۔۔ یہ تم بولیں، ۔۔۔ میں نے پھر تمھیں مخاطب کیا۔ "ان جھونپڑوں میں پھیلاؤ ہے زرین۔ ان کی گودیوں میں انسانیت پلتی ہے ۔۔۔ ہاں زرین! ان جھونپڑوں میں درد، بے بسی، لاچاری اور مفلسی کے مدھر مدھر نغمے سننے میں آتے ہیں اس بستی میں حیوانیت سے بھرے اصولوں کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ یقین کرلو...... مستقبل قریب میں یہ جھونپڑے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔"

"تو پھر کسی پہاڑی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ۔۔۔" اب تم نے بیزاری ظاہر کرتے کہا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان آنسوؤں میں ایک پہاڑی لڑکی ابھری۔ ایک پہاڑی لڑکی ...... اس کا نام سودی تھا ...... سودی جس کا ایک جھونپڑے میں جنم ہوا تھا ...... اور جھرنوں، آبشاروں اور کہساروں سے کھیلتی ہوئی جوانی جوان ہوئی تھی ۔۔۔ اپنے بوڑھے باپ کے کھیت کو شاداب کرتی تھی ...... سودی بہت بہادر اور جفاکش لڑکی تھی ۔۔۔ اور تمھاری طرح خوبصورت بھی۔ گاؤں کی ساری لڑکیاں اس کی گرویدہ تھیں ...... سودی سورج نکلنے سے پہلے ... [illegible] کام کر [illegible] جوانی [illegible]

بنا دیا۔۔۔۔۔ قیامت کے آثار روشن ہوئے۔۔۔۔۔ انسان بدل گیا۔۔۔۔
انسانیت کا سودا حیوانوں کی بستی میں ہونے لگا۔ اس کے دو دیہاتی بھی کام آ گئے
اور آس پاس کی گھاٹیوں میں انسانیت سوز واقعات رونما ہوتے۔ دیکھ کر مودی
کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اس نے چاہا کہ ان درندوں کی اینٹ سے
اینٹ بجا دوں۔ جو بے بسوں، لاچاروں اور بیچیوں کا جینا دوبھر کرنے میں مگن ہیں۔
مودی نے اپنی سہیلیوں میں جا کے ان خونخواروں اور ساہوکاروں کے خلاف
آواز بلند کی۔ جنہوں نے بے بسوں کی عزت پہ ڈاکہ ڈالنا اپنا ایمان تصور
کیا تھا۔۔۔۔ مودی نے ایک جلوس بھی ترتیب دیا اور ہاتھ میں سلامتی دامن
کا جھنڈا لئے وہ سہیلیوں سمیت پہاڑی کے آس پاس کی بستیوں میں گشت کرنے
لگی۔۔۔۔۔۔ اس کے لبوں پر امن اور زندگی کا گیت تھا۔ اور ان نام نہاد
انسانوں کے خلاف وہ بہت کچھ کہتی گئی۔

۔۔۔ گاؤں۔ کے درندے سرمایہ داری کے دیوتا کی توہین برداشت نہ
کر سکے۔ ایک دن انہوں نے ٹھان لی کہ جیسے بھی ممکن ہو، مودی کو ہوس کا شکار
بنا لیا جائے اور اسے بھی باقی بے زبان کلیوں کی طرح مسل کے رکھ دیا
جائے۔

غرض ایک دن موقع پا کے سیٹھ کے اہل کار مودی کو لے اڑے۔ جب کہ
وہ شام کے وقت کھیت سے واپس گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔۔۔۔ مودی
مالک کو پکارنے لگی۔۔۔۔ لیکن جو اس وقت اس کی فریاد سننے سے رہ گیا۔

نے مودی کے باپو سے کہا کہ اس کی بیٹی سیٹھ کے بنگلے میں قید ہے۔ اور وہ خطرے میں ہے ـــــ ایک کسان بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ ظالم ساہوکار اس کی بیٹی کو اغوا کرے۔

سیٹھ نے غریب کی خود دار غربت کی توہین کی تھی ـــ اس ظالم اور بے دردنے اس کی خوابیدہ رگ حمیت کو پھڑکنے کا موقع دیا تھا۔ لاغر ہونے کے باوجود وہ ہمت کر کے بنگلہ کی طرف تیزی سے چل پڑا ـــــ لیکن وہاں پہونچنے سے پہلے ہی اسے بیٹی کی لاش دیکھنا پڑی۔ اس کی آنکھیں. مودی کی لاش دیکھ کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ـــــ مودی جس نے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی خاطر بنگلہ کے اوپر سے کود کر زمین کو چوما تھا.

مودی آج بھی مجھے یاد ہے۔۔۔۔ اچھی طرح یاد ہے..... اس کی یادگار دور صحرا میں اب بھی زندہ جاوید ہے۔ آفرین ہے اس پر..... کتنا خیال تھا اسے انسانیت کا!..... کاش میں ان دنوں جیل کی چار دیواری سے باہر ہوتا۔ مجھے وہ لڑکی بہت پسند تھی۔ زرّین ـــــ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ تم تو کسی نئی سوچ میں ڈوب گئیں ـــــ تمھارے گلابی چہرے کا رنگ آن کی آن میں خزاں رسیدہ پتوں کی صورت اختیار کر گیا تھا. میں نے دیکھا تم برابر سوچ رہی تھیں...... شاید میرے ہرجائی پن کے بارے میں.....“

یقین کرو! زرین میں ہرجائی نہیں ہوں اور نہ تھا۔ اور اگر تم نے

ایسا سوچا تھا۔ تو بڑا بھاری گناہ کیا تھا ـــــ زرین! میں عورت کے درجہ کو
پہچانتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ اور اس کی قدر کرتا ہوں ـــــ اگر میں بے وفا اور
ہرجائی ہوتا تو کرنل کی لڑکی نرگس کو کب کا اپنا لیا ہوتا۔ حالانکہ وہ بھی
جوان ـــــ اور خوبصورت تھی ۔۔۔۔ وادی کے گیت گاتے ہوئے
تو وہ خود تان سین کی سندر تان بن جاتی تھی۔ اس کے سینے میں بھی
تمہاری طرح پیار بھرا دل تھا ـــــ نرگس کا باپ ریٹائرڈ کرنل تھا۔ عمر
رسیدہ۔ وہ بھی میری زندگی میں آئی۔ اور تو اور گھر والوں نے بھی فیصلہ
سنا دیا۔ کہ ہم نرگس کو ہی بہو بنائیں گے۔ بہن بھائیوں کی خواہش یہی تھی۔
کہ میں نرگس کو ہی اپنی زندگی کا ہم پلہ بناؤں۔ وہ اسے بھابی کے نام سے
پکارنے لگے ۔۔۔۔۔ ادھر سے نرگس کے والدین بھی زبان دے چکے تھے۔
۔۔۔۔ لیکن میرے دل کی آرزو دل میں ہی رہی ـــــ میری کسی نے بھی نہ
سنی ۔۔۔۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ سچ ہے کہ مجھے نرگس
سے ہمدردی تھی۔ لگاؤ تھا اور پیار تھا ۔۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے کہ اس
کے دلآویز گیت میرے زخموں پر مرہم کا کام کرتے تھے۔ مجھے اس کے گیتوں
سے پیار تھا۔ جس پیار کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے میں روز شہر سے
دور آبشار کے دامن میں ٹیلے پر بیٹھا نرگس کا انتظار کیا کرتا تھا ـــ اور
نرگس پاؤں سے ساز بجاتی گنگناتی ہوئی نمودار ہوتی تھی ۔۔۔۔ کتنی
کشش تھی اس کی آواز میں ۔۔۔۔ کس قدر پیار جھلکتا تھا۔ اس کی
باتوں میں ۔۔۔۔ میں تو انہیں ... گیتوں میں کھو کر

رہ جاتا تھا۔ اور یہ سلسلہ پہروں تک جاتا ہی رہتا۔ لیکن اس ملاپ کا مطلب دنیا والوں نے نہ جانا۔ انھوں نے اس ملاپ کا غلط مطلب لے لیا۔ جس کی مجھے امید نہ تھی۔ وہ ہماری زندگیوں کو ایک کر دینے کے بارے میں سوچنے لگے۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میرا دل ایسا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے نرگس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

انھوں نے جان لیا کہ اس کو پاکر میرا جیون سورگ کی صورت اختیار کرے گا۔ اور ان لوگوں نے مجھ سے پوچھے بغیر میرے سارے راستے بند کر دیئے۔۔۔۔۔ مجھے سماج کا ڈر۔۔۔۔ ابا جان کی سفید داڑھی کا واسطہ دیا گیا۔۔۔۔۔ خاندان کی عزت سامنے لاکر کھڑی کر دی گئی۔ یہاں تک کہ ایک بہن نے مرنے کی دھمکی بھی دی۔۔۔۔ غرض ان سب چیزوں نے یکجا ہو کر میری آرزوؤں، تمناؤں اور امیدوں کا گلا گھونٹ دینا چاہا تھا۔ لیکن میری محبت اور مستقل مزاجی میں سوت بھر کا فرق نہ آیا۔ یہ آسمان سے ہم کلام پہاڑ۔۔۔۔ لہلہاتے ہوئے کھیت۔۔۔۔ پھولوں سے لدی ہوئی پڑی کیاریاں۔۔۔۔۔ سندر اور دلآویز جھیل۔۔۔۔ اونچے اونچے محل۔۔۔۔ بل کھاتی ہوئی نشیب کی طرف رواں دواں ندی اور مست ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے درخت مجھے زندگی بنانے کی دعوت دے رہے تھے۔ لیکن میں ان کے داؤں میں بھی نہ آیا۔ اور۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے اپنے گیتوں کی ملکہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔

نرگس نے میرے ہرجائی پن کو جاننے پہ زندگی کا خاتمہ اپنے ہاتھوں
سے کردیا۔ اس نے بزدلی کا دامن تھاما .... ہاں! ہاں! نرگس
نے مصنوعی موت کے گلے لگ کے موذی کا ساتھ دیا۔ فرق صرف اتنا
تھا کہ موذی نے عزت بچانے اور آبرو کی رکشا کرنے کی خاطر موت کا جام
پی لیا۔ اور نرگس نے اپنی محبت پروان نہ چڑھتے دیکھ کے زندگی کا
گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ موذی کو مجبور کیا گیا کہ وہ موت کا ساتھ
دے لیکن نرگس نے خود ہی موت کی آغوش میں پناہ لی۔!

کتنے دل شکن تھے وہ الفاظ جو نرگس موت کے گلے لگنے سے پیشتر میرے
نام لکھ گئی تھی .... اب بھی وہ آنسوؤں کے خون سے داغ دار کیا ہوا
کاغذ مجھے نرگس کی یاد دلاتا ہے۔ لکھا تھا۔

"بے وفا ..... ہرجائی ..... پتھر دل ..... تجھے کس کس
نام سے پکاروں ..... لغو اور بے بنیاد ..... ارے ستم گر اگر
تجھے میری موت سے خوشی مل جائے، تو میں اسے بھی خوش نصیبی
سمجھوں گی ___ لیکن تجھے کچھ بھی نہ ملے گا۔ ایک معصوم اور بے بس
کی دنیا برباد کر کے تجھے پچھتانا پڑے گا۔ اُف تیری پیار بھری
باتوں نے مجھے تیرا گرویدہ بنا لیا تھا۔ میں نے تجھے امرت جان
لیا ..... لیکن تم نے بیہودہ اور زہر ثابت ہوئے تمہارے
ظاہری برتاؤ کے باعث میں تمہاری اور صرف تمہاری ہو کر رہ گئی

کی۔ اور مجھے ٹھکرا دیا..... میرے پیار کی قدر نہ کی....

اس کا بدلہ تمہیں ضرور ملے گا۔

اچھا ایک بار پھر مجھے اپنا لکھنے دو..... جانِ تمنا....

کتنا سُندر لفظ ہے یہ! اور کس قدر مٹھاس ہے اس میں۔

خوش رہو۔ اور زندگی کے ہر زاویئے پر ایک ایسی میٹھی

چوٹ کھاؤ کہ میری یاد آتی رہے اب میں اس دنیا کو چھوڑ کر

جا رہی ہوں۔ کیونکہ یہاں پر انسان کا حق دبایا جاتا ہے۔

..... اب مجھے اس بات کا بخوبی علم ہوا کہ یہ دنیا انسانوں

کی نہیں بلکہ وحشی درندوں کی ہے۔ جو اپنے عیش و آرام کے لئے

دوسروں کو برباد کرنا اپنا فرض جان لیتے ہیں۔ اور اپنا اُلّو

سیدھا کرنے کی خاطر دوسروں کی تمناؤں اور خوشیوں کو پامال

کرنا اپنا ایمان جان لیتے ہیں۔ اس لئے میں اس دنیا کو چھوڑ کر

جا رہی ہوں۔ تاکہ تم میری غیر موجودگی میں پورے طور سے دل کے

ارمان نکال سکو اور کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ اس

مکر و فریب۔ دھوکہ اور دغا بازی سے بھرپور دنیا کو ہمیشہ

کے چھوڑ کر میں اس دنیا میں جا رہی ہوں جہاں وحشی انسانوں

کا گزر نہیں۔ جو کسی کے ارمانوں سے کھیل کر اس کا جینا کٹھن

بنا دیتے ہیں۔ میرے دل کے دیوتا!!

ہیں پہنچ چکی ہوں گی .... اس لئے اس خط کو میری آخری نشانی تصور کر کے اپنے پاس محفوظ رکھنا ــ ہو سکتا ہے گاہے گاہے تمھیں میری یاد دلاتا رہے ـــــ اچھا خدا حافظ ....

تمھاری نرگس

مجھے نرگس کی اس بزدلانہ حرکت پر سخت افسوس ہوا........ کافی افسوس اور اپنے آپ کو مدتوں کوستا رہا کہ نرگس کے دل سے میں بدگمانی دور نہ کر سکا...... کاش میں اس گیتوں کی ملکہ کو اپنا سینہ چیر کر دکھا سکتا۔ تو وہ خود دیکھ لیتی کہ میرے دل کی بستی میں کون محبت کی جوت روشن کئے بیٹھی ہے ـ کاش ایسا ہو سکتا تو نرگس مجھے غلط نہ جان لیتی۔ اس کے دل میں بدگمانی جنم ہی نہ لیتی ـ افسوس! نرگس نے تو میرے ظاہری رنگ اور روپ کو دیکھا۔ لیکن میرے دل کی گہرائیوں میں جا کے اصلیت پرکھنے کی کوشش نہ کی۔

"زرین! اب بتاؤ! کیا میں ہرجائی ہوں" ـــــ اور جب میں نرگس کے خیال سے چونکا تو یہ سوال تم سے کیا.... کوئی جواب تم نے نہیں دیا۔

..... اوہ! ـــ

تم ہچکیاں لے رہی تھیں ـــــ میں اٹھ بیٹھا! مجھے اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ چاند اسی دمک سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا۔ گویا آج کی چاندنی رات دائمی بن گئی تھی .... لیکن زرین! تم برابر رو رہی تھیں ـــ

"تم کیوں رو رہی ہو زرین!" میں نے تمھارے جھکے ہوئے سر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ اف کتنے اشک بہائے تھے تم نے .... آنکھیں رو رو کر لال کر لی تھیں اور گرم گرم آنسوؤں سے سارا آنچل بھرا پڑا تھا۔

"میری محبت کی لاج رکھو شہناز۔ ورنہ میں کہیں کی نہ رہوں گی.... یقین کر لو تمھارے بغیر میں بنا جل کی مچھلی ہوں۔ تمھارے بغیر یہ زندگی بے کیف بے مزہ ہے...... مجھے مت ٹھکرا...... میرا ساتھ دو۔ تم ہی میرے دل کے تاجدار ہو...... دل کے مالک ہو — تم سے ہی میری تمام امیدیں وابستہ ہیں" — نہ جانے تم کن تصورات میں کھو کر کہے جا رہی تھیں —

"شہناز! اب میں زیادہ دیر تک تم سے دور رہنا نہیں چاہتی.... میری راتوں کی نیند...... دل کا چین تیرے بغیر لٹتا نظر آ رہا ہے.... ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم ہر وقت سامنے ہوتے ہو۔ اور آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوتے ہوں.... شہناز مجھے تنہا نہ چھوڑ دو — اگر زندہ رہنا ہے تو مجھے ساتھ رکھو...... اگر مرنا ہو تو مجھے بھی ساتھ ہی مار دو...... لیکن میری محبت کا مذاق نہ اڑاؤ...... میں محبت کی بھیک مانگتی ہوں۔ میری لاج رکھو...... مجھے صرف تم سے غرض ہے۔ تمھاری دولت شہرت سے نہیں — تم جو کچھ بھی ہو...... جیسے بھی ہو...... میرے ہو شہناز! میرے ہو!" اور اتنا کچھ تم غالباً ایک ہی سانس میں کہہ گئی تھیں۔" اس کا انحصار تمھارے والدین کی رضامندی پر ہے۔ زرین —" میں نے تمھیں

جواب دیا۔ تمہاری ہچکیاں یک لخت بند ہو گئیں۔

تم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں ..... گہری سوچ ...... اور میں حسب عادت تمہاری زلفوں سے کھیلنے لگا ـــــ تم برابر سوچ رہی تھیں ـــــ شاید تمہیں اپنے ابّا جان کے وہ احساسات یاد آگئے ـــــ جن کا اظہار وہ کئی مرتبہ کر چکے تھے۔

" یہ شہناز ایک آوارہ لڑکا ہے۔ اس کے خیالات باغی اور ارادے خطرناک ہیں۔ اس کا مستقبل روشن نہیں، بلکہ تاریک ہے۔ وہ کبھی بھی نہیں ابھر سکے گا۔"

اور شاید تم بھائی جان کے اس جملے پر بھی غور کر رہی تھیں۔ جس کو انھوں نے ایک بھری محفل میں دہرایا تھا۔

"جو آپ کو نہ بنا سکے ...... وہ دوسروں کی رکھشا کیا خاک کرے گا۔ شہناز ایک قلاش باپ کا بیٹا ہے۔ غریبی اور مفلسی کے صحرا میں بھٹکتے ہوئے اسے ساری زندگی گزارنا ہے۔ اس کے افلاس زدہ ماحول میں تو میری لاڈلی بہن کا دم گھٹ جائے گا۔"

زرین تم برابر سوچ میں پڑی تھیں ـــــ تمہاری اس طویل خاموشی نے مجھے مجبور کر دیا۔ کہ میں تم سے اور کچھ پوچھوں۔

" زرین! وہ دیکھو چاند جھیل میں اشنان کر رہا ہے۔ وہ دیکھو چکور کن بیقرار نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ دیکھو زرین کیسا سہانا سماں ہے۔ اور [illegible] اپنی [illegible] آ [illegible] گی تو [illegible] جانے کیا سمجھے گا۔؟ کیوں

زرین آج کل کچھ لکھتی بھی ہو یا عشق ہی عشق ہے؟......"

اتنے سارے سوالات کا جواب دیئے بغیر ہی تم میری باہوں سے جدا ہوگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تم مجھے فضا میں پرواز کرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں سکتے کے عالم میں پڑا ہوا تمھیں تکتا رہا برابر ٹکٹکی باندھ کر ـــــ اور پھر تم چاند میں جا کر جذب ہوگئیں۔ ہاں زرین تم چاند میں جذب ہوگئیں۔

میرا خیال ٹوٹ گیا۔ میری دنیا اجڑ گئی۔ زرین! کہاں ہو۔ کیا اس وقت تمھیں میری یاد نہیں ستاتی ہے۔ کیا تم نے مجھے قلاش جان کر ٹھکرا دیا.. یا پھر آبا جان اور بھائی جان کے کہنے سے مجھ سے نفرت کرنے لگیں ـــ بے بس جان کے"۔ قلاش باپ کا بیٹا جان کے ...... لیکن زرین تم ایسا نہیں کر سکتیں...... میں تمھارے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ تم تو صرف میری ہو کر رہ گئی تھیں ـــ تم نے ایک انسان سے محبت کی تھی۔

زرین! تمھارا وہ خط بھی میرے پاس ہے۔ جو تم نے کچھ عرصہ ہوا مجھے ارسال کیا تھا ـــ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس خط کے بعد تمھاری طرف سے ایک پرچی بھی نہ ملی ـــ کیا بات ہے۔ زرین! یہ خاموشی کس لئے اور کیوں! صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں۔ کہ...... نہیں! نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ زرین میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے ٹھکرا کر کسی اور کے من کا دیپ نہیں جلاؤ گی۔ ..... اتنا بڑا ظلم تم محبت پر نہیں کر سکتیں زرین ـــ! جب بھی تمھاری یاد آتی ہے تو وہ آخری خط پڑھنے لگتا ہوں۔ تو معلوم نہیں... اس خط میں کیا کچھ لکھا تھا... لکھا تھا۔

"دل کے تاجدار خوش رہو ——— میں اب بھی تمہاری ہوں اور مرتے دم تک تمہاری رہوں گی۔ میں نے پیار کیا ہے۔ کوئی پاپ نہیں۔ لیکن میرے گھر والے مجھے مارنے پر تلے ہوئے ہیں ——— میرے شہناز وہ محبت کے پاک اور پوتر جذبہ کو ٹھیس پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ میرے لئے ایک ایسا شوہر چاہتے ہیں۔ جو بڑا آفیسر ہو۔۔۔۔۔ جس کے پاس بنگلے ہوں۔ جو مجھے موٹروں میں سیر کرائے۔ جو مغربیت کا رنگ جما کے مجھے بڑی عظیم الشان پارٹیوں اور کلبوں میں لے جا کے۔ جو عیش و عشرت کے سمندر کا مالک ہو۔ تاکہ اس سمندر میں ڈوب کر میں زندہ لاش بن جاؤں۔۔۔۔۔ ایک بے جان مورتی بن جاؤں ——— میرے مالک ——— انھوں نے محبت کا گلا گھونٹنے کے لئے مجھ پر سختی سے پابندی لگا دی ہے۔ میں اس پابندی سے مجبور ہوں لیکن اس کا مطلب کہیں یہ مت لینا کہ میں تم کو بھول جاؤں گی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میری روح تمہاری ہے۔ یقین مانو میں صرف تمہاری ہوں۔ اور سدا تمہاری رہوں گی۔ میں نے فی الحال شادی سے صاف انکار کر دیا ہے۔ ضمیر، افسر اور ممتاز میاں وغیرہ ہماری راہ میں حائل ہو گئے تھے۔ لیکن میں ان سبھوں کو ٹھکرا دیا ——— میں اب چاہتی ہوں کہ پھر سے تعلیم کا سہارا لے کر اسے مکمل کر دوں۔ تاکہ بعد میں اپنے آپ کو معاشی بندھنوں سے آزاد کر لوں۔ اگر اس میں کامیاب نہ ہوئی تو شہناز میں بھی اب اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔"

ہاں ہاں میں محبت کو زندہ جاوید بنانے کی خاطر موت کی آغوش میں

پناہ لوں گی۔ لیکن کسی دوسرے کا دامن نہ تھاموں گی۔ تم خوش رہو۔۔۔۔
میری دعائیں ہر وقت تمھارے ساتھ ہیں۔"

زرین! یہ خط میرے پاس ہے۔ تم نے اس میں اپنی ثابت قدمی ظاہر کی تھی۔ اور میرا یہ یقین تھا کہ تمھارا ساتھ مجھے ملے گا۔۔۔۔۔۔ میرا ایمان تھا کہ ہمارا ملاپ ہو گا۔ اور تمھاری امنگوں پر پہرہ بٹھانے والے روئیں گے۔

زرین میرا ارادہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پاکر پھر انھیں مرغ زار دل کی طرف جائیں گے۔ ان ڈھلوان پہاڑیوں کو اپنائیں گے۔ جہاں دنیا کے حسین و جمیل ہونے کا ثبوت مستحکم ہوتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان کو قدرت کی لازوال طاقت کا احساس بجا طور پر ہوتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔۔ گھنٹے دنوں ــ دن ہفتوں اور مہینوں میں بدل گئے۔ لیکن تمھاری طرف سے برابر خاموشی جاری ہے۔۔۔۔۔ آخر کیوں؟ ــــ زرین کہیں تم نے بھی موت کا دامن تو نہیں تھاما۔۔۔۔۔ کہیں تم نے بھی مودی اور نرگس کی طرح اس بے وفا سنسار سے کنارہ کشی تو اختیار نہیں کی۔ کہیں تم بھی مجھے تڑپ تڑپ کر زندگی گزارنے کے لئے اکیلا تو نہیں چھوڑ گئیں۔ جواب دو زرین! یقین کرو۔ بستی کو چھوڑ کر اس صحرا میں بھی کسی طور دل نہیں لگتا۔ کتنی بستیاں میں نے چھان ماریں۔۔۔ کتنے صحراؤں کو میں نے پھاند لیا۔ لیکن تمھارا نشان کہیں نہ ملا۔۔۔۔۔ آخر کس جگہ تم نے بسیرا کر لیا ہے۔ جہاں بھی ہو مجھے آواز دو۔ ورنہ زرین اس لق و دق صحرا میں یہ دم گھٹ جائے گا۔ اور پھر لاکھ چاہنے پر بھی مجھے نہ پا دگی۔

اُبال

"میں سچ کہتا ہوں حضور.... عورت کو کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ عورت دھن دولت اور راحت ٹیم ٹام کی دلدادہ کم ہوتی ہے۔ وہ دراصل پیار کی بھوکی ہوتی ہے.......... پیار کے بدلے وہ بے لوث پیار چاہتی ہے۔ اس پیار کے بدلے اسے روکھی سوکھی روٹی کھانے اور ننگی سکڑی زمین سونے کو مل جائے تو وہ اُف نہ کرے گی، بلکہ ہنسی خوشی سب کچھ برداشت کرے گی۔"

کاغذات کا پلندہ سامنے سرہانی پر کھولے سجائے سلطان اب کی بار برجستہ انداز میں سب کچھ کہہ گیا۔ معاً اس کے چہرے پر استعجاب کے خطوط ابھرے اور اس کی نظریں تصور کے آئینے پر گڑ گئیں۔

"لیکن سلطان! کیا واقعی سعیدہ بھی محض چاہتی ہے۔ تم سے پیار کرتی ہے۔"

کچھ اور جاننے کی ٹوہ میں اشتیاق صاحب نے تجاہل انداز اپنایا۔

"حضور! یقین جانئے سعیدہ مجھے دل وجان سے چاہتی ہے۔ اس نے

میری ابتر و بے سود زندگی کو رنگینی و دلچسپی کے لمحات سے ہمکنار کر دیا۔ میں سچ کہتا ہوں صاحب اگر سعیدہ میری زندگی میں نہ آتی تو یقیناً زندہ در گور ہونا ہونا پڑتا ...... اس نے شریک حیات بن کے میری چھوٹی سی نگری میں قدم کیا رکھ دیا کہ میری زندگی ہی بدل کر رہ گئی۔ ایک ترتیب اور ایک قرینہ سما گیا میری روزمرہ زندگی میں ہر سکھ کو اپنے روبرو رقصاں پاتا ہوں ___ میں اس شریف النفس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے ...... حضور اس کی پیار بھری ڈانٹ نے سگریٹ پینے کی عادت بھی مجھ سے چھڑائی ... ایک ہی علت تھی وہ بھی اسے برداشت نہ ہو سکی"۔

سلطان نے یہ سب کہہ کے چپ سادھ لی۔ یا پھر اسے احساس ہوا کہ وہ وہ خواہ مخواہ بے مطلب بول گیا ہوں۔ اشتیاق صاحب خاموش رہے اس سے پہلے کہ وہ سلطان سے کچھ اور پوچھ لیتا کہ سلطان کمرے سے باہر چلا گیا ___ گولڈ فلیک کا لمبا کش لئے کرسی کے پشت سے اپنے شانوں کو چپیان کئے کئے۔ اشتیاق کمرے کی چھت کو گھورنے لگا۔ جس کا بیشتر حصہ دھوئیں سے اٹا پڑا تھا ___ کش پہ کش لئے وہ کبھی کبھی مرغولے چھوڑنے لگا۔ مرغولوں کے بکھرے دائرے چھت کی جانب اڑ کے پھیلنے لگے۔ سامنے ایشٹرے میں ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑوں کا دھواں ایک چھوٹی چمنی کی صورت اوپر کو جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں سے کمرے کا بالائی حصہ مکمل طور پر بھر گیا۔ ان سیاہ و تاریک گوشوں میں گھورنے سے اشتیاق صاحب کی دماغی وسعتوں میں بیتی ہوئی زندگی کے کچھ پہلو ابھرنے لگے۔ ذہن اور تحت الشعور

کے ہلکے و موسوم پردے پہ گئی گزری تصویریں واضح انداز میں رقص کرنے لگیں ـــــ غرض تصورات کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں اور اشتیاق کا ماضی اسکے سامنے جلوہ نمائی کرنے لگا۔

..... اشتیاق کالج میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ اس کالج سے ملحق ہائی اسکول میں اس کے لنگوٹیے یار اکبر اردو کے استاد تھے۔ ایک روز کالج اور اسکول کے ماحول سے نکل کر کافی ہاؤس کی جانب چلتے ہوئے اکبر کہہ گیا تھا۔

"ارے اشتیاق تم میرے کہے پر یقین کیوں نہیں کرتے۔ میں سعیدہ کو دل و جان چاہتا ہوں۔ اسے پیار کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے والہانہ طور پر چاہتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس محبت کو زندہ جاوید دیکھنے کی غرض سے ہم ازدواجی زندگی میں منسلک ہو جانا چاہتے ہیں۔ اشتیاق تم میرے گہرے دوست ہو.... اپنی رائے سے نہیں نوازو گے"۔

ویسے اشتیاق کم گو اور حد درجہ خلوت پسند تھے۔ لیکن کھری و حق پرستی سے لبریز باتیں سنانے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا.... ساتھ میں کسی یک کو اپنے میں دل چسپی لیتے دیکھے اس کے احساسات کا احترام کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ اکبر کی زبانی سعیدہ کی نسبت خیالات جان کر اشتیاق کی زبان کام کر گئی۔

"اکبر تم میرے عزیز ترین دوست ہو اور میں نہیں چاہوں گا کہ میرے

دوست کی زندگی یا میرے دوست کے ہاتھوں کسی اور کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے۔ اگر اس معاملے میں تم میری رائے جاننا چاہتے ہو تو میں کہوں گا کہ عشق و محبت کے رموز کنایات سے تم ابھی واقف نہیں ہو۔ بحرِ بے کراں کے اتار چڑھاؤ و مدوجزر کا تمھیں احساس نہیں اور پھر بھی اپنی کشتیٔ حیات کو ان فوجوں کے سپرد کر دینے کے درپے ہو۔ یہ کہاں کی دانش مندی ہے۔ محبت محبت کی رٹ لگائے میرے دوست محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھ پاؤ گے۔ نہ اس طرح پیار کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکو گے کیوں متاعِ زیست خواہ مخواہ لٹانے کی سوچ رہے ہو۔"

یہ سب سن کے اکبر کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ اور نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"اشتیاق تمھیں ہو اکیا ہے۔ کیا میرے کہنے پر تمھیں یقین نہیں آیا! یقین کر لو ہم نے ایک دوسرے کو بلا کسی غرض و غایت کے چاہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سعیدہ کے بنا مجھے چین و کل نصیب نہ ہو گا۔ وہ میری زندگی اور میری روح ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ تم باور کر دیا نہ کرو لیکن سعیدہ میرے روشن مستقبل کی نقیب ہے۔ میری خوشیوں کی پیامبر۔ میں اسے سدا کے لئے اپنے سے منسلک کرنا چاہتا ہوں۔ تا کہ مجھے ابدی خوشی حاصل ہو سکے۔"

"اگر تم سعیدہ کو نہیں بلکہ اس کی جوانی و خوبصورتی پر فریفتہ ہو۔" اشتیاق اب کی بار بات کاٹ کے کہہ گیا۔"

"ہاں اکبر میں تمھاری عادت سے واقف ہوں۔ تم سعیدہ کے متوازن خدو خال کے دلدادہ ہو۔ تم ہر خوبصورت چیز کو چاہنے لگتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم آج سعیدہ کو چاہنے لگے ہو۔ میں کہوں گا کہ ان حسین لوازمات کے پھیر میں پڑ کے کسی ایک سے محبت جتانا بے عقلی و نادانی ہے۔ یہ وقتی سلسلہ کسی نہ کسی وقت ٹوٹ جائے گا۔ پھر تم بدل جاؤ گے اور تمھارے سر سے محبت کا جنون اترے گا۔ محبت کے پاک و پوتر جذبہ کو جاننے سمجھنے کے لئے تمھیں ارمانوں کا خون کرنا پڑے گا۔"

اشتیاق نے ایک دو بار سعیدہ کو نزدیک سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اسی کالج میں زیر تعلیم تھی۔ جہاں وہ پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مزید تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی خاطر اشتیاق کو سرکاری خرچہ پر بیرون ہندوستان جانا پڑا۔ اس کا انگلینڈ میں دو سال سے زیادہ قیام رہا۔ اس دوران اکبر و سعیدہ کی شادی خانہ آبادی کا دعوتی کارڈ اسے ملا تھا۔ آخر اکبر نے محبت کا چکر چلا کے سعیدہ کو دام فریب میں پھانس لیا تھا۔ وہ خوش بھی تھے۔ کہ اسی کے دوست کی دلی مراد بھر آئی تھی۔

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ آثار قدیمہ سے متعلق ٹریننگ حاصل کر کے اشتیاق واپس آ گئے۔ اسی محکمہ میں اسے اعلیٰ عہدہ پر تعینات کیا گیا۔۔۔ پرانے زمانے کی یادگاریں و دیگر تعمیرات کو منظر عام پر لانے کی غرض سے اشتیاق کو ریاست کے طول و عرض میں دیگر عملے کے ساتھ گھومنے کا موقع ملا۔ اسی دوران اشتیاق اتنا جان گیا کہ

اکبر مقامی کالج میں اردو لیکچرار کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور سعیدہ استانی کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ اب تو دو بچے بھی ان کے گھرانے کی رونق بڑھا گئے تھے۔۔۔۔۔ لیکن دونوں کے تعلقات میں کشیدگی سما گئی ہے ــــ اپنی شریک حیات رضیہ کی وساطت اشتیاق پر یہ حقیقت آشکارا ہو کے رہ گئی کہ سعیدہ کس قدر سلیقہ شعار اور روشن خیال عورت ہے۔ اور اکبر خود کتنے تنگ نظر و فریب۔

سردیوں میں دفاتر سری نگر سے جموں منتقل ہوتے ہیں اس بار اشتیاق کو بھی جموں جانا پڑا اور پھر ڈیڑھ ماہ بعد اسکول موسم سرمائی چھٹیوں کے باعث بند ہو گئے اور رضیہ بچوں سمیت جموں آگئی۔۔۔۔ اسکی کی زبانی اشتیاق کو علم ہوا کہ اکبر نے سعیدہ کو اپنے سے الگ کر دیا ہے اور وہ بیچاری بچوں کو لے کر جموں ماں باپ کے گھر آگئی ہے۔۔۔۔۔۔

۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ ہی روز گزرنے پر ایک دوست کی زبانی یہ جانکاری ملی کہ اکبر نے سعیدہ کو طلاق دیدی ہے۔ اشتیاق یہ سب کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ حالت میں سراسیمگی چھانے لگی۔ اس قدر سرعت کے ساتھ تعلقات ختم ہو جانے کے اسباب باوجود کوشش کے وہ نہ جان سکا

ایک دن سعیدہ کی زبانی اپنے دوست کی بابت اسے طرح طرح کی باتیں

سن سن کے اشتیاق پریشان ہو گئے اور اصلیت جاننے کی ٹوہ میں اس نے اکبر کے نام نامہ ارسال کر دیا۔ جواب ملنے کے انتظار میں ہفتے گزر گئے...... لیکن اکبر نے چپ سادھ لی۔ اور پھر اشتیاق نے اسکی بابت سوچنا بھی ترک کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سب کچھ فراموش کر گیا۔ ویسے اس نے ایک بار چاہا تھا کہ سعیدہ سے مل کے اصلیت جان سکے۔ لیکن ضمیر نے اجازت نہیں دی۔

اچانک گئے ہفتے اشتیاق کو اس خبر نے چونکا دیا کہ سعیدہ نے نے سلطان کے ساتھ شادی کر لی ہے وہ بھی عدالت میں جا کے۔

اشتیاق کو پہلے یقین نہیں آیا۔ لیکن پھر سلطان سے پوچھنے پر اصلیت واضح انداز میں سامنے ابھرنے لگی۔ سلطان اس کے دفتر کا چپراسی تھا۔ اشتیاق کے ذہن میں ارتعاش سما گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

... کیا ایک ماسٹرانی (ماسٹرانی) خواندہ، سلیقہ شعار اور کہاں ایک چپراسی.... جاہل اور بد مزاج سلطان ــــــ یہ کیسا ملاپ اور میل ہے ــــ"

اگر ایک اچھے عہدیدار کے ساتھ وہ زندگی نہ کاٹ سکی تو سلطان کے ساتھ اس کی کیسے گزر ہو گی۔

"چائے پی لیجئے حضور" ــــ یہ سلطان تھا۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اشتیاق اپنی سوچوں کی دنیا سے واپس لوٹے۔ !! اس کے تصورات کی دنیا سمٹ گئی۔ اب وہ تھا۔ دفتری کمرہ اور

سامنے فائیلوں کا ڈھیر!

سلطان پر ایک نظر ڈالے بغیر اشتیاق نے کپ اٹھا کے چائے کی چسکی لینی شروع کر دی۔ اور ساتھ ہی ساتھ کاغذات کے انبار میں کھونے لگا۔

سلطان سے سعیدہ کی بابت اور زیادہ پوچھنا اشتیاق نے مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ دنوں بعد سلطان نے ڈاک سے موصول شدہ خطوط کا پلندہ اشتیاق کے سامنے رکھ دیا۔ اشتیاق نے جھٹ سے ایک لفافہ اٹھا لیا تحریر اکبر کی تھی۔

ایک نظر سلطان پر ڈالے کے اس نے لفافہ چاک کر دیا۔ اور خط کی گدازیوں میں کھونے لگا۔

"آج میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ پریشانی کے بحر بے کراں کی موجوں میں مقید میری کشتی زیست کو سالم حیثیت میں کنارے لگا دینا اب تمہارے ہاتھوں میں ہے —— میں تمہاری امداد کا طالب ہوں —— اشتیاق یہاں اپنے کالج میں ایک لڑکی زیر تعلیم ہے۔ قدسیہ نام ہے۔ بہت ہی زیرک اور دانا ہے۔ اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ یقین کر یہ قدسیہ میری روح اور میری زندگی ہے۔ میں اسے سدا کے لئے اپنے سے منسلک کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ قدسیہ کو اپنے قریں کرنے سے میری زندگی

میں بشاشت و خوشی ہر گوشے سے پھوٹ پڑے گی ......

اس کے بغیر میں زندہ رہنے کی بابت سوچنا بھی گناہ تصوّر کرتا ہوں۔

اشتیاق یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے ...... تم

قدسیہ کے والد کو اس بابت تحریر کر دو! ایڈریس لکھے

دیتا ہوں۔" فقط

تمھارا ....

اکبر

اشتیاق نے خط پڑھ کے سلطان کے ہاتھوں میں تھما دیا اور اسے

نذرِ آتش کرنے کو کہا۔ سلطان نے تیلی سلگا لی اور چند لمحوں میں خط نے

راکھ کا روپ دھار لیا۔ اشتیاق کے چہرے پر بشاشت تیرنے لگی — اور

دفعتاً پاس پڑے رائٹنگ پیڈ کو داغدار کرنے لگا۔!

اکبر صاحب!

تمھیں دوست کے نام سے یاد کرنے میں شرم محسوس

ہوتی ہے۔ تم دوستی کے نام پر بدنما داغ ہو۔ تمھارے کرتوتوں

کی نسبت جانکاری حاصل کئے میرا سر ندامت سے جھک گیا ہے۔

میں نے اخوانِ شیاطین میں سے تمھیں پایا ہے۔ ہاں ہاں!

تمھاری ہستی کو میں ابلیس کے زمرے میں ایستادہ پاتا ہوں۔ تم

چوپائے سے بدتر ہو۔ تم نے مجبور۔ پیار کے پاک جذبے کو

ٹھیس پہنچائی۔ تم سمجھتے کہ کیا سمجھ گئے کہ تمھیں اپنی

قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں ہے۔

سعیدہ سے تمھارا جی بھر گیا۔ اس کے جذبات کو مجروح کر کے اپنی زندگی سے ایسے الگ کر دیا جس طرح دودھ سے مکھی الگ کی جاتی ہے.... میرا دل کہتا ہے کہ سعیدہ کی طرح قدسیہ کو بھی تم اپنے سے قرین کر دو گے اور پھر اس کے احساسات سے کھیلے جب جی بھر جائے گا تو اسے بھی اپنے سے الگ کرنے کی بابت سوچو گے.... میں تمھیں قدسیہ کی بابت کوئی مشورہ نہیں دینا چاہتا۔ البتہ خدا تمھیں اتنی عقل بخشے کہ تم نیک و بد میں تمیز کر سکو۔"

فقط

اشتیاق

خط لفافے میں بند کر کے اشتیاق نے سلطان کے ہاتھ لیٹر بکس میں ڈالنے کی غرض سے دیدیا۔ اور خود سرکاری ڈاک جانچنے میں محو ہو گیا۔

آشنا ز اشنا

حولدار آج مسلسل دو دن کی بیہوشی کے بعد ہوش میں آ گئے تو سب سے پہلے اس کی نظر نرس سے جا ٹکرائی۔ جو اسکے بازو میں بیٹھی سفید کپڑوں میں ملبوس ایک اپسرا لگ رہی تھی۔

دھن ...... دھن ...... دھن "___؟

حولدار نے دفعتاً دونوں ہاتھ سینے پر رکھے۔ "جوان آگے بڑھو۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا مت کرو۔" نرس نے اسے سہارا دیا۔ او۔ وہ پھر بے ہوشی کے عالم میں بستر پر دراز ہو گیا۔

سارا ہسپتال زخمی جوانوں اور گھائل فوجیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو مستعدی کے ساتھ لگاتار کام کرنا پڑتا تھا ___

راج جب دوبارہ ہوش میں آئے تو اس نے حال کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں سے وہاں تک بستروں کی قطاریں ..... کراہٹیں۔ اور چیخیں ...

اور پھر لمحہ بعد نرس اس کے بازو آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کون ہو تم بہن! جو شہد کی مکھی کی طرح کام کئے جا رہی ہو؟"

"میں نرس ہوں۔ میرا نام شیلا ہے۔"
اتنا کہہ کر اس نے دوا کے دو چمچے اس کے حلق میں انڈیل دیئے اور کہا۔
"دیکھئے آپ کے داہنے کندھے اور کنپٹی میں گہری چوٹ آئی ہے۔ زیادہ بات کرنا آپ کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔"
شیلا ہنس مکھ، ملنسار اور انتھک کارکن تھی۔ وہ اپنا کام صرف دوا کھلانے اور ٹمپریچر لینے تک ہی محدود نہیں رکھتی تھی بلکہ اپنی پیاری باتوں سے زخمی جوانوں کا دل بھی بہلاتی تھی۔
کبھی ان کے ساتھ تاش کھیلتی...... شطرنج سے دل بہلاتی؟.... کبھی ان کا دل خوش کرنے کے لئے کوئی فلمی گانا گنگناتی۔ اور کبھی کافی رات گئے تک انہیں کہانیاں سناتی ——!
حولدار راج اسے بہت چاہنے لگے تھے۔ جب شیلا ایک روز دشمن کے زخمی سپاہی کا درجۂ حرارت ریکارڈ کرنے لگی تو اس نے بدکلامی سے کام لیا۔
"کافر کی ذات مجھے دوا کی ضرورت نہیں...۔ مجھے مرنے دو"——
"دگل زماں! یہ ہسپتال ہے محاذ جنگ نہیں۔ یہاں مذہب اور نسل سے بالاتر ہر ایک کا علاج کرنا ہمارا فرض ہے۔" شیلا نے اسے دلاسا دیا۔
تو تم میری مریض ہو...... کہ حولدار راج بستر چھوڑ کر گل زماں سے

لڑائی کرنے لگے۔

"ایسا لڑتا ہے جیسے نرس کا عاشق ہو۔" گل زماں بدزبانی پر اتر آیا۔

"کمینہ! میں تیری بوٹی بوٹی نوچ لوں گا۔"

"جانے دو راج!" شیلا نے بات کاٹ دی۔ اور راج کو بستر پر لٹا دیا۔ پھر دیر گئے گل زماں اور راج ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ شیلا نے ان کا ساتھ دیا۔

———

آج خلاف معمول شیلا افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اداسی دیاسیت کے ملے جلے اثرات ٹپک رہے تھے۔ سارے وارڈ میں یہ بات ہوا کی طرح پھیل گئی۔

"بہن! آج اداس سی کیوں ہو۔" صبر وضبط کی حدوں کو پھاند کر آخر راج نے پوچھ لیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں راج! تم خوش رہو۔ دو چار دنوں میں تمھارا آپریشن ہونے والا ہے۔" شیلا نے موضوع سخن بدلنے کی سعی اپنائی۔

"نہیں شیلا تمھیں میری قسم بتاؤ۔ اس اداسی کا سبب کیا ہے"۔

اور پھر شیلا کے کہنے پہ راج جان گیا کہ اس کا منگیتر اشوک ٹینک شکن دستے کا انچارج بن کر محاذ جنگ پہ گیا ہوا ہے۔ مہینے سے اس کی جانب سے کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ یونٹ ہیڈ کوارٹر سے رجوع کرنے پر بھی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔

راج کو یہ سب جان کر بڑا دکھ ہوا۔ اور وہ بار بار شیلا کو دلاسا دیا کرتا تھا۔
۔۔۔بہن بھگوان پہ بھروسہ رکھو۔ اشوک زندہ واپس آئے گا۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔"

کچھ روز بعد کچھ جوانوں کو چھٹی مل گئی اور ان کی جگہ دوسرے زخمی فوجیوں نے پر کر لی۔ ہر ایک سے بے نیاز راج شیلا کو ڈھونڈنے میں مگن تھا اور اسی اضطراب میں اس نے ملحقہ کمروں کا گشت لگانا شروع کر دیا۔ دفعتاً کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"شیلا! اشوک دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ....."

"نہیں کرنل انکل! ایسا مت کہیئے! میں اس کی جدائی برداشت نہ کر پاؤں گی۔"

کرنل نے شیلا کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔

"بیٹی تمھیں صبر سے کام لینا چاہیئے۔ اتنا جان لو کہ تمھارے منگیتر نے کتنے بلند مقصد کے حصول کے لئے جان دیدی! اپنی جنم بھومی کی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر اس مہان ہستی نے پران تیاگ دیئے۔"

راج اس کے آگے کچھ نہ سن پایا۔ فقط شیلا کے رونے کی آواز۔

وہ دبے پاؤں واپس بستر پہ دراز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ اتنا غمزدہ ہوا کہ شیلا کو تسلّی دینے سے بھی رہ گیا۔ اس کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئی ہو۔

سشیلا کا چہرہ اب اُترا اُترا تھا۔ وہ اب گانا نہیں گنگناتی تھی۔ یا منظرِ بہ نہیں کھیلتی اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پہ ہنسی رقص کرتی تھی جیسے دفعتاً سے افسردگی و مایوسی کے بحرِ بیکراں میں غرق ہونے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہو۔

"بہن! صبر سے کام لو! میرا دل کہتا ہے اشوک ضرور واپس آئے گا" راج آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے کہہ گیا ۔۔!

"بھیا میرا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے اب میں کس کے لیے زندہ رہوں۔ کس کے لیے..... اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُف کتنا فرق تھا۔ پہلے والی اور آج کی سشیلا میں۔!

راج کا آپریشن ہوا۔ اس کے سر پہ پٹی بندھی تھی۔ اور مسلسل تین روز وہ بیہوشی کے عالم میں رہا۔ ہوش آنے پہ راج نے سشیلا کی کھوج شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ وہ دو دنوں سے ہسپتال نہیں آئی ہے۔ کہاں گئی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔"

اتنے میں بازو میں پڑے زخمی جوان پہ راج کی نظر پڑی جس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی تھی۔ صرف منھ اور ناک کے نتھنے کھلے تھے۔ باقی سارا چہرہ سفید کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے سامنے نرس کملا بیٹھی تھی ۔۔۔!

"سسٹر یہ کون ہیں؟" راج نے نرس سے پوچھا۔

"ٹینک مین اشوک..... رات ہی کو ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔۔۔"

"اشوک" راج کے حلق میں الفاظ پھنس کے رہ گئے۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ راج کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اشوک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"شیلا! نزدیک آؤ، اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لو۔ دیکھو میرے ہاتھ برف کی طرح سرد پڑ گئے ہیں۔"

راج نے ایک نظر اشوک پر ڈالی۔ دوسری کملا پر...... جو رومال سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اشوک کے قریب پلنگ پر بیٹھ کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگی۔

"کتنا سکون ملتا ہے شیلا، مقصد اپنے قریب پا کے...... تمہاری پاک محبت نے شیلا آخر مجھے موت کے منہ سے بچا لیا۔"

ڈاکٹروں نے شیلا کی جگہ کملا کو دی تھی! اس غرض سے کہ اشوک کے دل پر چوٹ نہ لگے۔ راج کملا کی اس قربانی پر پہروں سوچا کرتا۔

کتنا تضاد ہے کملا اور شیلا میں! ایک شیلا اپنے محبوب کی نسبت غلط خبر سن کر فرار ہی کا راستہ اپنا گئی۔ دوسری کملا جس کا شوہر چند روز قبل ہی ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ گیا زندگی کے لیے تیار کھڑی غم دوراں کا مقابلہ کرنے میں مگن تھی۔ شیلا نے زندگی سے گھبرا کر موت کا دامن تھامنا اپنے لئے موزوں جان لیا اور اس کے برعکس کملا موت کی دہلیز کو خیرباد کہہ نا امیدی کے صحرا سے درکناری حاصل کئے زیست کی راہوں سے وابستہ رہی اور پھر ایک ہی ہفتہ بعد اشوک کی پٹی کھلنے والی تھی۔

"کیا آپ نے کبھی غور کر کے دیکھا ہے" باتوں باتوں میں ایک دن راج کہہ گیا۔

" کیسے دیکھتا۔ امنگی کی رسم منانے کے لیے ہی مجھے محاذ پہ جانا پڑا تھا۔
البتہ اس کی تصویر میرے پاس ہے اور کچھ خطوط "۔
اشوک بہ حیثیت کہہ گیا۔ اور راج نے دیکھا کہ کملا اداس اُداس کھڑکی کے
سامنے جا کے رونے لگی.... اپنی بد بختی پر۔ وہ سوچنے لگی کہ پٹی کھلنے پر
اشوک پر حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ وہ جان جائے گا کہ شیلا کی جگہ
کملا نے لے لی ہے۔ یہ سب جان کے اشوک پر کیا گزرے گی۔
آخر وہ امتحان کی گھڑی آ گئی۔ پٹی کھلنے سے قبل اشوک نے ڈاکٹروں سے
التجا کی کہ شیلا کو اس کے روبرو رکھا جائے۔ تاکہ وہ پٹی کھلنے پر سب سے پہلے
اسے دیکھ لے۔ ڈاکٹروں نے سمجھا بجھا کر کملا کو سامنے رکھ دیا۔ لیکن سب کے
سب اس انجام سے باخبر تھے۔ جو پٹی کھلنے پر رونما ہونے والا تھا۔
کملا کی حالت ابتر تھی۔ افسردگی اور مایوسی کے نقوش اس کے چہرے
پر رقص کر رہے تھے۔ وہ سہمی سہمی سی تھی۔ جیسے اسے کسی نے چوری کرتے
رنگے ہاتھوں پکڑا ہو۔ اس نے اشوک کی بے لاگ خدمت کرنے میں دن رات
ایک کر دیئے! اور وہ کسی حد تک زندگی سے پیار کرنے لگی تھی۔ اپنے مرحوم
پتی کی یاد اسے ہر وقت تڑپائے رکھتی تھی۔ لیکن اب اشوک کی دیکھ ریکھ
کرنے پر اس کے اجڑے دل میں زندہ رہنے کی خواہش از سر نو پیدا ہو گئی تھی!
اب پٹی کھلنے پر وہ پھر سے بے سہارا ہو جائے گی۔ پھر سے وہ اکیلی رہ جائے
گی۔ وہ سوچنے لگی کہ دراصل بھگوان نے اس کی قسمت میں مذاق کے سوا
کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ جو قدم قدم پر ٹھوکریں اور نا امیدی اس کا تعاقب

کیا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انور نے اشوک کی پٹی کھول دی۔ دوسروں کے علاوہ حولدار راج اور کملا بھی سامنے بیٹھے تھے۔ پٹی کھل گئی لیکن آنکھیں بے نور۔

"ڈاکٹر!..... شیلا..... میں دیکھ نہیں سکتا۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا ڈاکٹر! شیلا! تم کہاں گئیں۔ تم سب لوگ کہاں چلے گئے۔"

سب کے سر جھکے تھے۔ سب کے سب کملا کو دیکھنے لگے۔ جو برابر رو رہی تھی! اتنے میں اس کے ضمیر نے جھنجھوڑا۔ اب وہ اندھا ہے اس کی آنکھیں بے نور ہیں۔ اسے اب مستقل سہارے کی ضرورت ہے۔"

اتنا سوچ کے کملا آگے بڑھی۔ اور اشوک سے والہانہ طور پر بغل گیر ہو گئی۔

"ڈارلنگ! میں تمھیں دیکھ نہیں سکتا۔ میں اندھا ہوں۔ اس دھرتی پر میری حیثیت ایک بوجھ سے کم نہیں۔ میں زندہ کیوں رہا..... میں"

"نہیں اشوک! کملا بات کاٹتے ہوئے گویا ہوئی۔"

"مجھے اپنی آنکھیں سمجھ لو! میں تمھاری شیلا ہوں۔ دل شکنی کی باتیں نہ کرو۔"

راج یہ سب کچھ دیکھ کر سوچنے لگا۔ کہ بلیدان کس نے دیا۔ شیلا نے! ــــ کملا نے!! یا اشوک نے!!!

مرزا پبلیکیشنز کی دو اہم اور دوسری کتابیں

۱۔ مرزا سلامت علی دبیر (ڈاکٹر محمد زماں آزردہ) قیمت =/50

اور

۲۔ سعادت حسن منٹو (ڈاکٹر برج پریمی) زیر طبع

ہم سے طلب کیجیے [illegible]

۱۔ غبار خیال (اردو انشائیے) مرزا آزردہ قیمت =/5

۲۔ شیریں کے خطوط (اردو انشا) " " =/10

۳۔ اور وہ ٹائپ کرگئی (اردو افسانے) " " =/5

۴۔ پھول کا ماتم " حسن ساہو =/10

۵۔ وادیاں بلا رہی ہیں (ناول) جان محمد آزاد =/10

۶۔ فکرِ ہنر ٹریکر (پہلا کشمیری انشائیوں کا مجموعہ) مرزا آزردہ " =/20

۷۔ غبار کارواں۔ (اردو انشائیوں کا مجموعہ) محمد زماں آزردہ " زیر طبع

(ملنے کا پتہ)

مرزا پبلیکیشنز حسن آباد۔ رعناواری سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۰۲